رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۰۳

جمادی الاول
جمادی الاخر ۱۳۷۰ھ
رجب المرجب

جلد ۳۵، عدد ۵، ۶
جلد ۳۶، عدد ۱

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ- لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے

اس پرچہ کی قیمت ۱/۱۴/-

ترجمان القرآن

فہرست مضامین

جلد ۳۵،۳۶ | جمادی الاولیٰ، جمادی الآخرہ، رجب ۱۳۷۰ھ مطابق مارچ، اپریل، مئی ۱۹۵۱ء | عدد ۵،۶،۱

سید ابوالخیر مودودی نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ سے چھپا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِشارات

تحریک اسلامی کے دوسرے مرحلے میں جماعت کی تنظیم اور تربیت جس طرح پر کی گئی اسے ہم پچھلی اشاعت میں بہت اختصار کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ ابھی یہ مرحلہ کچھ اور دراز ہوتا اور ہمیں اپنے نظم کو پختہ اور اپنے کارکنوں کی تربیت کو مکمل کرنے کا پورا موقع مل جاتا۔ لیکن اگست ۱۹۴۷ء میں تشکیل جماعت کے ٹھیک چھ سال بعد، وہ قیامت نظیر انقلاب رونما ہو گیا جس کی آمد کے آثار دیکھ کر ہی ہمیں پہلے مرحلے کی تکمیل کا انتظار کئے بغیر اگست ۱۹۴۱ء میں دوسرے مرحلے کی طرف قدم اٹھا دینا پڑا تھا۔ اِس قیامت صغریٰ نے ہمارے کام اور نظام پر دو حیثیتوں سے زبردست اثر ڈالا۔

اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ملک کی سیاسی تقسیم نے جماعت اسلامی کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پاکستان اور ہندوستان، دونوں کے حالات اور مسائل اچانک ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہو گئے کہ دونوں ملکوں میں ایک نظم، ایک پالیسی اور ایک رہنمائی کے تحت کام کرنا بالکل ناممکن ہو گیا۔ اگرچہ ان حالات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہمیں تقسیم سے پہلے بھی تھا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۴۷ء کی تقریر مدراس میں اِس طرف اشارہ بھی کر دیا گیا تھا کہ تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں ایک نظام جماعت قائم نہ رہ سکے گا، لیکن جب تقسیم فی الواقع رونما ہوئی تو ہمیں اپنے اندیشوں سے بھی کہیں زیادہ سخت حالات سے سابقہ پیش آیا، اور خبر رسانی کے ذرائع بحال ہوتے ہی پہلی فرصت میں ہم کو مسلم لیگ کی طرح یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ دونوں ملکوں کے نظام جماعت قطعی طور پر ایک دوسرے سے الگ کر دیے جائیں۔ یہ فیصلہ فروری ۱۹۴۸ء میں ہوا اور اس کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کی ہر چیز، بجز عقیدے اور مقصد کے، جماعت اسلامی ہندوستان سے الگ ہو کر رہ گئی۔[1]

---

[1] اس جگہ یہ معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ دونوں جماعتوں کی علیحدگی کے وقت جو ارکان جماعت پاکستان میں مقیم تھے یا ہجرت کر کے آ چکے تھے ان کی تعداد ۳۸۵، اور جو ارکان ہندوستان میں رہ گئے تھے ان کی تعداد ۲۴۰ تھی۔ اس وقت سے پاکستان کے ارکان کی تعداد بڑھتے بڑھتے اب ۹۴۵ تک پہنچ چکی ہے۔

دوسرا اثر اس سیاسی انقلاب کا یہ ہوا کہ جماعت اسلامی پاکستان کو یک لخت توسیع اور عملی اقدام کے مرحلے میں داخل ہو جانا پڑا حالانکہ نظم اور تربیت دونوں کے لحاظ سے ابھی ہمیں اپنی تکمیل کے لئے بہت کچھ کرنا باقی تھا۔

اس فوری پیش قدمی کا فیصلہ جن وجوہ سے کیا گیا انہیں اُسی زمانہ میں جماعت کے اُن اجتماعات میں بیان کر دیا گیا تھا جو مارچ و اپریل ۱۹۴۸ء میں ہوئے تھے۔ مختصراً وہ وجوہ یہ تھے۔ ۱۹۴۷ء کا سیاسی انقلاب ہماری نگاہ میں محض ایک مصنوعی انقلاب تھا یعنی وہ کسی ذہنی، اخلاقی اور اجتماعی انقلاب کے نتیجے میں رونما نہیں ہوا تھا، بلکہ زیادہ تر خارجی حالات کے تغیرّ اور دباؤ کے اثر سے واقع ہو گیا تھا۔ اُس کی پشت پر اگر کسی تعمیری قوت کی نشان دہی کی جا سکتی ہے تو وہ حد سے حد بس یہ ہے کہ ایک طرف انگریزی درسگاہوں اور محکموں کی تعلیم و تربیت سے مسلمانوں میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی تیار ہو چکی تھی جو ایک آزاد حکومت کے انتظام کا بار، بُرا یا بھلا کسی نہ کسی طرح اٹھا سکتے تھے۔ اور دوسری طرف مسلمانوں میں اپنی ایک آزاد حکومت قائم کرنے کی خواہش پوری طرح اُبھر آئی تھی جس نے خواص سے گزر کر عوام تک کو متحرک کر دیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک حقیقی اور پختہ اور نتیجہ خیز سیاسی انقلاب پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھیں۔ ان کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ مسلمانوں کے سامنے اُس نظام زندگی کا ایک واضح تصور موجود ہوتا جس پر انہیں آزادی کے بعد اپنی حیات قومی کا قصر تعمیر کرنا تھا، اور اُس تصور کے بارے میں ذہنی حیثیت سے وہ فی الجملہ یکسو ہوتے، کسی انتشارِ فکر اور پراگندگیٔ خیال اور اختلاف متعارض میں مبتلا نہ ہوتے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ مسلمان اخلاقی حیثیت سے اس حد تک صالح اور بالغ ہو چکے ہوتے کہ آزاد ہو جانے کے بعد وہ حکومتِ خود اختیاری کی ذمہ داریاں بآسانی اٹھا سکتے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ مسلمانوں میں صبر، ضبط، نظم، باقاعدگی، محنت، تعاون، مواساۃ، امانت، فرض شناسی، احساس ذمہ داری، حدود کی نگہداشت، اور وحدت و اخوت کے وہ اوصاف موجود ہوتے جو ایک کامیاب اجتماعی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔

اِن چیزوں کی کمی ہم اُسی وقت محسوس کر رہے تھے جب مسلمانوں میں اپنی مستقل حکومت کی خواہش ابھی

نئی نئی اُبھر رہی تھی۔ ہم نے اس کمی کی طرف اُن لیڈروں کو توجہ دلائی جن کے ہاتھ میں مسلمان اپنی زمام کار دے رہے تھے، مگر انہوں نے اسے صدائے بے ہنگام سمجھا۔ ہم نے خود اس کمی کو پُورا کرنے کی کوشش کی، مگر ہمیں اُلٹا دشمن سمجھا گیا اور مسلمانوں کو ہم سے بدگمان کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی گئی۔ اس حد پر بھی معاملہ رُکا نہ رہا بلکہ دس سال تک مسلمانوں کی قومی تحریک اس انداز سے چلائی گئی کہ مسلمانوں کا ذہن پہلے سے زیادہ پراگندہ، ان کے اخلاق پہلے سے زیادہ خراب، اور ان کے اجتماعی اوصاف پہلے سے بھی زیادہ گئے گزرے ہوگئے۔ مختلف خیالات، عقائد، نظریات، اغراض اور مقاصد رکھنے والے عناصر کو جمع کر لیا گیا جو اسلام کا نعرہ بلند کرنے کے ساتھ ہی بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہے کہ مسلمانوں کا رہا سہا اسلامی تصور بھی دھندلا ہو گیا اور عین پاکستان بننے کے وقت بھی وہ کچھ نہ جانتے تھے کہ وہ کونسا اسلام ہوگا جس پر یہ نئی ریاست تعمیر کی جائے گی۔ ہم نے اس پراگندہ خیالی پر بار بار ٹوکا، مگر جواب میں اُلٹا اس بات پر فخر کیا گیا کہ ہم نے قوم کے سارے مختلف عناصر کو جمع کر کے رکھ دیا ہے۔ حالانکہ یہ عناصر ایک منفی جنگ کے لئے تو اکٹھے ہو سکتے تھے، مگر ایک ایجابی تعمیر کا مرحلہ آتے ہی ان کا منتشر اور متصادم ہو جانا بادی النظر ہی میں یقینی تھا۔ ایسا ہی معاملہ اخلاقی اور اجتماعی حالت کا بھی تھا۔ قومی تحریک جس انداز پر چلائی جا رہی تھی اس نے مسلمانوں کو کسی جگہ پر بھی نہ ٹھیرنے دیا کہ انہیں کچھ اُوپر اُٹھایا جاتا۔ بدترین سیرت و اخلاق کے لوگ صحافت و قیادت پر قابض ہو گئے۔ ہر میدان میں غیر مسلموں سے مسابقت شروع ہو گئی۔ ہر بُرائی کا جواب کار ثواب سمجھ کر بُرائی سے دیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ دونوں قومیں ایک دوسری کی ضد میں گرتے گرتے اسفل السافلین تک پہنچ گئیں۔

یہ سارے حالات ہمارے سامنے گزر رہے تھے اور ان کے نتائج کو ہم خوب جانتے تھے۔ اس لئے جس روز تقسیم ملک کا اعلان ہوا اسی وقت ہم نے سمجھ لیا کہ جیسی بری یا بھلی تعمیری سعی بھی آج تک ہم کر سکے ہیں اب اسی پر اکتفا کرنا ہوگا اور اس قوم کو سنبھالنے کی فوری کوشش کرنی پڑے گی جو کسی واضح نصب العین کے بغیر اور کسی اخلاقی طاقت اور اجتماعی اصلاح کے بغیر یکلخت با اختیار ہو گئی ہے۔ اس فوری اقدام کی ضرورت کا احساس اُن حالات کو دیکھ کر اور بھی زیادہ شدید ہو گیا جو عین تقسیم کے وقت اور اس کے معاً بعد پیش آئے

ہندوستان کے بعض حصوں سے مسلمانوں کا خروج جس شان سے ہوا، پاکستان کے غیر مسلموں کی نکاسی جس طرح عمل میں آئی، غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی دولت کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا، اور مسلمان مہاجرین پاکستان میں جن حالات سے دوچار ہوتے، یہ سب کچھ ایک ایسا آئینہ تھا جس میں پوری قوم کی، اس کے عوام اور خواص کی اس کے لیڈروں اور پیشواؤں کی، اس کے حکام اور عمال کی، اس کے اہل دین اور اہل دنیا کی، غرض سب ہی کی اخلاقی اور اجتماعی تصویر بالکل برہنہ نظر آگئی۔ پھر اختیارات ہاتھ میں لیتے ہی ہماری قوم کے قائدوں نے، جو اب قائد ہی نہیں حاکم بھی تھے، ملک کے آئندہ نظام کے متعلق جیسی اُلجھی اُلجھی متضاد باتیں کرنی شروع کیں اور قوم جس طرح ابتدائی چند مہینوں میں ٹھنڈے دل سے ان کو سنتی رہی، اسے دیکھ کر صاف معلوم ہوگیا کہ اس وقت ایک بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکر گروہ کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری کام میں لگے رہنے کا نہیں ہے۔ اب اگر ایک لمحہ بھی ضائع کیا گیا تو بعید نہیں کہ جو لوگ منزل کا تعین کئے بغیر بے سوچے سمجھے چل پڑے تھے وہ یکایک کسی غلط نظریے کو اس نئی مملکت کی بنیاد قرار دے بیٹھیں اور پھر اس فیصلے کو بدلوانا موجودہ حالت کی بہ نسبت ہزار گنی زیادہ قربانیوں کے بغیر ممکن نہ رہے۔

خوش قسمتی سے اس زمانے میں متعدد آزمائشیں ایسی پیش آگئیں جن سے ہمیں تیسرے مرحلے کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے یہ اندازہ کرنے کا موقع مل گیا کہ ہماری جماعت اپنی اخلاقی تربیت اور اپنے نظم کے اعتبار سے اس وقت فی الواقع کتنی طاقت رکھتی ہے اور آگے کے مراحل میں اس پر کس حد تک اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

ان میں سے پہلی آزمایش ان لوگوں کو پیش آئی جو مشرقی پنجاب کے ہنگامۂ قیامت سے گزر کر پاکستان پہنچے تھے۔ ہم نے فرداً فرداً ان کے حالات کا تفحص کیا اور یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ صرف ارکان جماعت ہی نہیں، جماعت کے ہمدرد اور متاثرین تک ہمت و جرأت اور صبر و استقلال کے ساتھ اپنا فرض انجام دیکر آئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی لیگ کے لیڈروں کی طرح بھاگنے والوں میں سب سے آگے نہ تھا۔ کسی نے بزدلی نہیں دکھائی، کسی نے خود غرضی سے کام نہیں لیا۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ خطرے اور مصیبت میں اپنے بھائیوں کے ساتھ رہا۔ ہر ایک نے اپنی استطاعت کی حد تک مظلوم مسلمانوں کو بچانے، سنبھالنے اور منظم طریقہ سے نکالنے

کی کوشش کی بہت سوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کام کیا۔ اور اکثر و بیشتر اپنے علاقوں سے اس وقت نکلے جب وہ مسلمانوں سے خالی ہو چکے تھے۔

دوسری آزمائش مغربی پاکستان میں پیش آئی جہاں سے غیر مسلم نکل رہے تھے۔ یہاں بھی ہم نے پوری دقتِ نظر کے ساتھ جماعت کے رویّہ کا جائزہ لیا، اور یہ معلوم کر کے ہمیں اطمینان ہوا کہ جماعت کے ارکان ہی نہیں ہمدردوں اور متاثرین تک میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے کشت و خون یا لوٹ مار میں کوئی حصہ لیا ہو بعض مقامات پر تو پوری پوری بستیوں میں اگر لوٹ سے بچنے والے کچھ لوگ پائے گئے تو وہ صرف وہی لوگ تھے جنہوں نے جماعتِ اسلامی کا اثر قبول کیا تھا۔ متعدد مقامات پر جماعت کے لوگوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر بھی غیر مسلموں کو پناہ دینے میں تامل نہ کیا۔ اور کوئی ایک اطلاع بھی ہمیں ایسی نہیں ملی کہ جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کا دامن کسی غیر مسلم عورت کی آبروریزی سے آلودہ ہوا ہو، حالانکہ اس کے مواقع کی اُس وقت کمی نہ تھی۔

تیسری آزمائش اُس وقت پیش آئی جب جماعت کے کارکنوں کو پناہ گزینوں کے کیمپوں میں کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس آخری آزمائش نے ہمیں پوری طرح مطمئن کر دیا کہ اپنی تمام کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود جماعتِ اسلامی کے پاس اِس وقت مردانِ کار کا ایک ایسا گروہ تیار ہے جس کے اخلاق اور نظم پر اعتماد کیا جاسکتا ہے لاہور، کراچی، پشاور، سیالکوٹ، سرگودھا، لائل پور، چنیوٹ اور ملتان میں مجموعی طور پر جماعت کے تقریباً سات سو ارکان اور ہمدردوں نے پناہ گزینوں کی خدمت کا کام کیا۔ ان کارکنوں میں بہت سے وہ لوگ تھے جو خود پناہ گزین کی حیثیت سے آئے تھے اور ابھی کہیں جمنے بھی نہ پائے تھے۔ پھر بھی وہ خدمت کی پکار پر لبیک کہنے سے باز نہ رہے۔ ان لوگوں نے ایثار، جفاکشی، ہمدردی، دیانت، امانت، عفت اور نظم و ضبط کا پورا امتحان دیا، اور نتیجہ میں کم از کم جو چیز ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ ان اوصاف میں نہ حکومت کے عمّال ان سے کوئی نسبت رکھتے ہیں اور نہ قومی جماعتوں کے کارکن۔ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے سات سو آدمیوں میں سے ایک بھی ایسا نہ نکلا جو ناقابلِ اعتماد ثابت ہوا ہو۔ اور جہاں تک نظم کا تعلق ہے دو تین خفیف شکایتوں سے زائد کوئی چیز ہمارے علم میں نہیں آئی۔

یہ تھا وہ سرمایہ جسے لیکر ہم تیسرے مرحلے میں داخل ہوئے۔ اس مرحلے میں ہمارا پہلا قدم یہ تھا کہ براہ راست عوام تک پہنچ کر ان کے سامنے اُس اسلامی ریاست کے تصور کو ایک صاف اور متعین صورت میں پیش کریں جس کے صرف نعرے ہی نعرے انہوں نے اُس وقت تک سنے تھے اور جس کے فہم کے معاملہ میں ان کے لیڈروں نے ان کے ذہن کو اُلجھانے کے سوا کوئی دوسری خدمت اُس وقت تک انجام نہ دی تھی۔ یہ کام جنوری ۴۸ء میں شروع کیا گیا اور شاید ہم بلا شائبۂ مبالغہ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ قریبی دَور کی تاریخ میں پہلی مرتبہ شہری اور دیہاتی عوام کو وسیع پیمانے پر اسلامی نظامِ زندگی کے ایک جامع اور واضح تصور سے روشناس کرانے کی کوشش کی گئی۔ اس کام کے لئے صرف لٹریچر کی اشاعت اور مجلسی ملاقاتوں ہی پر اکتفا نہ کیا گیا، جیسا کہ جماعتِ اسلامی کا سابق طریق کار تھا، بلکہ جماعت کا ہر وہ رُکن جو ذمہ دارانہ طریقہ سے بول سکتا تھا، تقریر کا مجاز کر دیا گیا اور پاکستان کے گوشے گوشے میں جلسے کر کے عوام کو یہ بتایا گیا کہ آزاد ہو جانے کے بعد اب مسلمان ہونے کی حیثیت سے تمہاری ذمہ داریاں کیا ہیں، اسلام جس کے تم معتقد ہی نہیں عاشق بھی ہو، تمہیں کیا نظامِ زندگی دیتا ہے، اور وہ اسلامی ریاست فی الواقع کس قسم کی ریاست ہے جس کے قیام کی خاطر تم نے اتنی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اس کے ساتھ ملک کے کارفرما اور اہل دماغ طبقے کو بھی خطاب کیا گیا اور ان کو نہ صرف علمی حیثیت سے یہ بتایا گیا کہ ایک حقیقی اسلامی ریاست کے خدوخال کیا ہیں، بلکہ عملی حیثیت سے اس کو وجود میں لانے کی تدابیر بھی پیش کی گئیں اور ہر اُس حجت کو قطع کرنے کی کوشش کی گئی جو اس کے خلاف عذر کے طور پر سامنے لائی جا سکتی تھی۔ اس غرض کے لئے ۱۹۴۸ء میں جو چیزیں شائع کی گئیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اسلام کا نظامِ حیات،

۲۔ اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر،

۳۔ اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق،

۴۔ آزادی کے اسلامی تقاضے،

۵۔ مطالبۂ نظامِ اسلامی۔

دوسرا قدم جو پہلے قدم کے ساتھ ہی اٹھا دیا گیا، یہ تھا کہ عوام کے سامنے اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں کا ایک چہار نکاتی، جامع اور مختصر فارمولا پیش کیا گیا، اور رائے عام کو اس کے حق میں اس حد تک ہموار اور منظم کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ ایک قومی مطالبے کی حیثیت اختیار کرلے اور ملک کی دستور ساز اسمبلی اسے قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ قدم فوری طور پر اٹھا دینا اس لئے ضروری تھا کہ ملک کے سربراہ کار اس وقت صریح طور پر ایک غیر دینی (سیکولر) ریاست کے نظریہ کی طرف مائل تھے اور اس کے اعلان سے صرف ایک جھجک ان کو روکے ہوئے تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ اگر اس وقت ذرا سی غفلت بھی برتی گئی تو یہ موقع پاتے ہی آئینی طور پر ایک غیر اسلامی ریاست کی بنا رکھ دیں گے اور پھر اسے اسلامی ریاست میں تبدیل کرنا اس قدر دشوار ہوگا کہ جو کچھ آج تھوڑی سی قربانیوں سے ہو سکتا ہے وہ ہزاروں آدمیوں کے پھانسی پر لٹکنے سے بھی مشکل ہی ہو سکے گا۔

اس مہم کی ابتدا فروری ۱۹۴۸ء میں کی گئی اور چند مہینوں کے اندر اندر ہمارا مرتب کردہ مطالبہ پاکستان کی پوری مسلم قوم کا متفقہ مطالبہ بن گیا۔ برسر اقتدار گروہ اس مطالبے کا نہ انکار کر سکتا تھا اور نہ اس کڑوی گولی کو حلق سے اتارنے کے لئے تیار تھا۔ کچھ مدت تک وہ عالم حیرت میں اس پھیلتی ہوئی آگ کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ویسی ہی ایک چال چلی جیسی بزدل اور پست اخلاق لوگ ہمیشہ سے چلتے آ رہے ہیں۔ وہ چال یہ تھی کہ ایک گھڑی گھڑائی بنی ہوئی سازش سے راقم الحروف پر زبردستی یہ الزام چسپاں کیا گیا کہ وہ "جہاد کشمیر کو حرام" کہتا ہے اور جن لوگوں نے وہاں لڑ کر جان دی ہے ان کی موت کو "حرام موت" قرار دیتا ہے۔ اس الزام کو پوری قوت کے ساتھ اخبارات اور اشتہاروں اور سرکاری مولویوں کے ذریعہ سے پھیلایا گیا، نت نئے جھوٹ پوری بے شرمی اور بے باکی کے ساتھ تصنیف کر کر کے میرے اور جماعت اسلامی کے خلاف پھیلائے گئے۔ اس جھوٹ کو فروغ دینے کے لئے جماعت کے اخبارات کو بند کیا گیا تاکہ کوئی تردیدی بیان پبلک تک نہ پہنچ سکے، اور اس طرح چند مہینے تک فضا کو خوب ہموار کر لینے کے بعد اکتوبر ۱۹۴۸ء میں مجھے اور میرے دو ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا ـــــ اس سازش کی شرمناک داستان پوری تفصیل کے ساتھ جماعت کے شائع کردہ پمفلٹ "مودودی کی نظر بندی کیوں؟" میں بیان کی جا چکی ہے ـــــ بظاہر یہ بڑی ہی زبردست چال تھی۔ دیکھنے والے سمجھ رہے تھے کہ اس کے (بقیہ بر صفحہ ۳۴)

تفہیم القرآن

ابراہیمؑ

نام رکوع ۶ کی پہلی آیت وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا سے ماخوذ ہے۔ اس نام کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سورہ میں حضرت ابراہیمؑ کی سوانح عمری بیان ہوئی ہے، بلکہ یہ بھی اکثر سورتوں کے ناموں کی طرح علامت کے طور پر ہے۔ یعنی وہ سورہ جس میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول عام انداز بیان مکہ کے آخری دور کی سورتوں کا سا ہے۔ سورۂ رعد سے قریب زمانہ ہی کی نازل شدہ معلوم ہوتی ہے۔ خصوصاً رکوع ۳ کی پہلی آیت وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُم مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا (انکار کرنے والوں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے) کا صاف اشارہ اس طرف ہے کہ اُس وقت مکہ میں مسلمانوں پر ظلم و ستم انتہا کو پہنچ چکا تھا اور اہل مکہ پچھلی کافر قوموں کی طرح اپنے ہاں کے اہل ایمان کو خارج البلد کر دینے پر تُل گئے تھے۔ اسی بنا پر ان کو وہ دھمکی سنائی گئی جو اُن کے سے رویہ پر چلنے والی پچھلی قوموں کو دی گئی تھی کہ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ (ہم ظالموں کو ہلاک کر کے رہیں گے) اور اہل ایمان کو وہی تسلی دی گئی جو ان کے پیش رو دل کو دی جاتی رہی ہے کہ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْأَرْضَ مِن بَعْدِهِمْ (ہم ان ظالموں کو ختم کرنے کے بعد تم ہی کو اس سرزمین میں آباد کریں گے)۔

اسی طرح آخری رکوع کے تیور بھی یہی بتاتے ہیں کہ یہ سورہ مکہ کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہے۔

مرکزی مضمون اور مدعا جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ماننے سے انکار کر رہے تھے اور آپ کی دعوت کو ناکام کرنے کے لئے ہر طرح کی بدتر سے بدتر چالیں چل رہے تھے ان کو فہمائش اور تنبیہ لیکن فہمائش کی بہ نسبت اس سورہ میں تنبیہ اور ملامت اور زجر و توبیخ کا انداز زیادہ تیز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تفہیم کا حق اس سے

پہلے کی سورتوں میں بخوبی ادا کیا جا چکا تھا اور اس کے باوجود کفارِ قریش کی ہٹ دھرمی، عناد، مزاحمت، شرارت اور ظلم و جور میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

آ-ل-ر۔ اے محمدؐ! یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ،[۱] اُن کے رب کی توفیق سے[۲] اُس خدا کے راستے پر[۳] جو زبردست اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے[۴] اور زمین اور آسمانوں کی ساری موجودات کا مالک ہے۔

---

[۱] یعنی تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لانے کا مطلب شیطانی راستوں سے ہٹا کر خدا کے راستے پر لانا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر وہ شخص جو خدا کی راہ پر نہیں ہے وہ دراصل جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے، خواہ وہ اپنے آپ کو کتنا ہی روشن خیال سمجھ رہا ہو اور اپنے زعم میں کتنا ہی نورِ علم سے منور ہو۔ بخلاف اس کے جس نے خدا کا راستہ پا لیا وہ علم کی روشنی میں آگیا، چاہے وہ ایک اَن پڑھ دیہاتی ہی کیوں نہ ہو۔

[۲] پھر یہ جو فرمایا کہ تم ان کو اپنے رب کے اذن یا اس کی توفیق سے خدا کے راستے پر لاؤ، تو اس میں دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی مبلغ، خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، راہِ راست پیش کر دینے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ کسی کو اس راستہ پر لے آنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ اس کا انحصار سراسر اللہ کی توفیق اور اس کے اذن پر ہے۔ اللہ کسی کو توفیق دے تو وہ ہدایت پا سکتا ہے، ورنہ پیغمبر جیسا کامل مبلغ بھی اپنا پورا زور لگا دینے پر اس کو ہدایت نہیں بخش سکتا۔ رہی اللہ کی توفیق، تو اس کا قانون بالکل الگ ہے جسے قرآن میں مختلف مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے ہدایت کی توفیق اُسی کو ملتی ہے جو خود ہدایت کا طالب ہو، ضد اور ہٹ دھرمی اور تعصب سے پاک ہو، اپنے نفس کا بندہ اور اپنی خواہشات کا غلام نہ ہو، کھلی آنکھوں سے دیکھے، کھلے کانوں سے سنے، صاف دماغ سے سوچے سمجھے، اور معقول بات کو بے لاگ طریقہ سے مانے۔

[۳] "حمید" کا لفظ اگرچہ محمود ہی کا ہم معنی ہے، مگر دونوں لفظوں میں ایک لطیف فرق ہے۔ محمود کسی کو اس وقت کہیں گے جبکہ اس کی تعریف کی گئی ہو یا کی جاتی ہو۔ مگر حمید آپ سے آپ حمد کا مستحق ہے، خواہ کوئی اس کی حمد کرے یا نہ کرے۔ اس لفظ کا پورا مفہوم "قابلِ تعریف"، "سزاوارِ حمد"، "ستودہ صفات" وغیرہ الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا، اسی لیے ہم نے اس کا ترجمہ "اپنی ذات میں آپ محمود" کیا ہے۔

اور سخت تباہ کن سزا ہے قبول حق سے انکار کرنے والوں کے لئے جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے، جو اللہ کے راستے سے لوگوں کو روک رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ راستہ ان کی خواہشات کے مطابق ٹیڑھا ہو جائے۔ یہ لوگ گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں۔

ہم نے اپنا پیغام دینے کے لئے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے، اُس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔ پھر اللہ جسے چاہتا ہے بھٹکا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) شخص کو اسی وقت کہیں گے جبکہ اسکی تعریف کی گئی ہو یا کی جاتی ہو۔ مگر حمید آپ سے آپ حمد کا مستحق ہے خواہ کوئی اسکی حمد کرے یا نہ کرے۔ اس لفظ کا پورا مفہوم ستودہ صفات، سزاوار حمد اور مستحق تعریف جیسے الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے ہم نے اس کا ترجمہ "اپنی ذات میں آپ محمود" کیا ہے۔

[1] یا با الفاظ دیگر جنہیں ساری فکر بس دنیا کی ہے، آخرت کی پروا نہیں ہے۔ جو دنیا کے فائدوں اور لذتوں اور آسائشوں کی خاطر آخرت کا نقصان تو مول لے سکتے ہیں، مگر آخرت کی کامیابیوں اور خوشحالیوں کے لئے دنیا کا کوئی نقصان، کوئی تکلیف اور کوئی خطرہ، بلکہ کسی لذت سے محرومی تک برداشت نہیں کر سکتے۔ جنہوں نے دنیا اور آخرت دونوں کا موازنہ کر کے ٹھنڈے دل سے دنیا کو پسند کر لیا ہے اور آخرت کے بارے میں فیصلہ کر چکے ہیں کہ جہاں جہاں اُس کا مفاد دنیا کے مفاد سے ٹکرائے گا وہاں وہ اُسے قربان کرتے چلے جائیں گے۔

[2] یعنی وہ اللہ کی مرضی کے تابع ہو کر نہیں رہنا چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا دین ان کی مرضی کا تابع ہو کر رہے۔ ان کے ہر خیال، ہر نظریے اور ہر وہم و گمان کو اللہ کا دین اپنے عقائد میں داخل کرے اور کسی ایسے عقیدے کو اپنے نظام فکر میں نہ رہنے دے جو ان کی کھوپڑی میں نہ سماتا ہو۔ ان کی ہر رسم، ہر عادت اور ہر خصلت کو سند جواز دے اور کسی ایسے طریقے کی پیروی کا ان سے مطالبہ نہ کرے جو انہیں پسند نہ ہو۔ وہ ان کا ہاتھ بندھا غلام ہو کہ جدھر جدھر یہ اپنے شیطان نفس کے اتباع میں مڑیں ادھر وہ بھی مڑ جائے اور کہیں نہ تو وہ انہیں ٹوکے اور نہ کسی مقام پر انہیں اپنے راستہ کی طرف موڑنے کی کوشش کرے۔ وہ اللہ کی بات صرف اسی صورت میں مان سکتے ہیں جبکہ وہ اس طرح کا دین ان کے لئے بھیجے]

[3] اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو نبی جس قوم میں بھیجا (باقی صفحہ ۲۶۸ پر)

ہدایت بخشتا ہے، وہ بالادست اور حکیم ہے۔

ہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی اپنی نشانیوں کے ساتھ اس کام کے لئے بھیج چکے ہیں کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائے۔ اسے محمدؐ! تم ان لوگوں کو تاریخ الٰہی کے سبق آموز واقعات سنا کر نصیحت کرو،

(بقیہ حاشیہ ۲۶۹) اس پر اسی قوم کی زبان میں اپنا کلام نازل کیا تاکہ وہ قوم اسے اچھی طرح سمجھے، اور اسے یہ عذر پیش کرنے کا موقع نہ مل سکے کہ آپ کی بھیجی ہوئی تعلیم تو ہماری سمجھ ہی میں نہ آتی تھی پھر ہم اس پر ایمان کیسے لاتے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض معجزہ دکھانے کی خاطر کبھی یہ نہیں کیا کہ رسول تو بھیجے ہندوستان میں اور وہ کلام سنائے چینی یا جاپانی زبان میں۔ اس طرح کے کرتبے دکھانے اور لوگوں کی عجائب پسندی کو آسودہ کرنے کی بہ نسبت اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں تعلیم و تلقین اور تفہیم و تبیین کی اہمیت زیادہ رہی ہے جس کے لئے ضروری تھا کہ ایک قوم کو اسی زبان میں پیغام پہنچایا جائے جسے وہ سمجھتی ہو۔

لے یعنی باوجود اس کے کہ پیغمبر ساری تبلیغ و تلقین اسی زبان میں کرتا ہے جسے ساری قوم سمجھتی ہے، پھر بھی سب کو ہدایت نصیب نہیں ہو جاتی، کیونکہ کسی کلام کے محض عام فہم ہونے سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ سب سننے والے اسے مان جائیں۔ ہدایت اور ضلالت کا سر رشتہ بہر حال اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی جسے چاہتا ہے اپنے اس کلام کے ذریعے سے ہدایت عطا کرتا ہے، اور جس کے لئے چاہتا ہے اسی کلام کو الٹی گمراہی کا سبب بنا دیتا ہے۔

ڪه یعنی لوگوں کا بطور خود ہدایت پالینا یا بھٹک جانا تو اس بنا پر ممکن نہیں ہے کہ وہ کاملاً خود مختار نہیں ہیں، بلکہ اللہ کی بالادستی سے مغلوب ہیں۔ لیکن اللہ اپنی اس بالادستی کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا کہ یونہی بغیر کسی معقول وجہ کے جسے چاہے الل ٹپ ہدایت بخش دے اور جسے چاہے خواہ مخواہ بھٹکا دے۔ وہ بالادست ہونے کے ساتھ حکیم و دانا بھی ہے۔ اس کے ہاں سے جس کو ہدایت ملتی ہے معقول وجوہ سے ملتی ہے، اور جس کو راہ راست سے محروم کر کے بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے وہ درحقیقت اس سلوک کا مستحق ہوتا ہے۔

ستہ "ایامؔ" کا لفظ عربی زبان میں اصطلاحاً یادگار تاریخی واقعات کے لئے بولا جاتا ہے۔ "ایام اللہ" سے مراد تاریخ انسانی کے وہ اہم ابواب ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے گزشتہ زمانہ کی قوموں اور بڑی بڑی شخصیتوں کو ان کے اعمال کے لحاظ سے جزا یا سزا دی ہے۔

اِن واقعات میں بڑی نشانیاں ہیں[1] ہر اُس شخص کے لئے جو صبر اور شکر کرنے والا ہو[2]۔
یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا "اللہ کے اُس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ اس نے تم کو فرعون والوں سے چھڑایا جو تم کو سخت تکلیفیں دیتے تھے، تمہارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ بچا رکھتے تھے۔ اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔ ع اور یاد رکھو، تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر شکر گذار بنو گے[3] تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے[4]۔" اور موسیٰ نے کہا کہ "اگر تم کفر کرو اور زمین کے سارے رہنے والے

---

[1] یعنی ان تاریخی واقعات میں ایسی نشانیاں موجود ہیں جن سے ایک آدمی توحیدِ خداوندی کے برحق ہونے کا ثبوت بھی پا سکتا ہے اور اس حقیقت کی بھی بے شمار شہادتیں فراہم کر سکتا ہے کہ مکافات کا قانون ایک عالمگیر قانون ہے اور وہ سراسر حق اور باطل کے علمی و اخلاقی امتیاز پر قائم ہے، اور اس کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ایک دوسرا عالم یعنی عالمِ آخرت ناگزیر ہے۔ نیز ان واقعات میں وہ نشانیاں بھی موجود ہیں جن سے ایک آدمی باطل عقائد و نظریات پر زندگی کی عمارت اٹھانے کے برے نتائج معلوم کر سکتا ہے اور ان سے عبرت حاصل کر سکتا ہے۔

[2] یعنی یہ نشانیاں تو اپنی جگہ موجود ہیں مگر ان سے فائدہ اٹھانا صرف انہی لوگوں کا کام ہے جو اللہ کی آزمائشوں سے صبر اور پامردی کے ساتھ گذرنے والے ہوں اور اللہ کی نعمتوں کو ٹھیک ٹھیک محسوس کر کے ان کا صحیح شکریہ ادا کریں۔ چھچھورے اور کم ظرف اور احسان ناشناس لوگ اگر ان نشانیوں کا ادراک کر بھی لیں تو ان کی یہ اخلاقی کمزوریاں انہیں اس ادراک سے فائدہ اٹھانے نہیں دیتیں۔

[3] یعنی اگر ہماری نعمتوں کا حق پہچان کر ان کا صحیح استعمال کرو گے، اور ہمارے احکام کے مقابلہ میں سرکشی و استکبار نہ برتو گے، اور ہمارا احسان مان کر ہمارے مطیع فرمان بنے رہو گے۔

[4] یہ مضمون بائیبل کی کتاب اِستثنا میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ اس کتاب میں حضرت موسیٰ اپنی وفات سے چند روز پہلے بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کے سارے اہم واقعات یاد دلاتے ہیں، پھر توراۃ کے ان تمام احکام کو دہراتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو بھیجے تھے، پھر ایک طویل خطبہ [illegible]

بھی کافر ہو جائیں تو اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود ہے ۔

(بقیہ حاشیہ ۲۶۹) دیتے ہیں جس میں بتاتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے رب کی فرمانبرداری کی تو کیسے کیسے انعامات سے نوازے جائیں گے اور اگر نافرمانی کی روش اختیار کی تو اس کی کیسی سخت سزا دی جائے گی ۔ یہ خطبہ اس کتاب کے ابواب نمبر ۴-۶-۸-۱۰-۱۱ اور ۲۸ تا ۳۰ میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے بعض بعض مقامات کمال درجہ موثر و عبرت انگیز ہیں مثال کے طور پر اس کے چند فقرے ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن سے پورے خطبے کا اندازہ ہو سکتا ہے :

" سن اے اسرائیل ! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے ۔ تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا کے ساتھ محبت رکھ ۔ اور یہ باتیں جن کا حکم آج میں تجھے دیتا ہوں تیرے دل پر نقش رہیں ۔ اور تو ان کو اپنی اولاد کے ذہن نشین کرنا اور گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اٹھتے ان کا ذکر کرنا ۔" (باب ۶ - آیات ۴ - ۷)

" پس اے اسرائیل ! خداوند تیرا خدا تجھ سے اس کے سوا اور کیا چاہتا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کا خوف مانے اور اس کی سب راہوں پر چلے اور اس سے محبت رکھے اور اپنے سارے دل اور ساری جان سے خداوند اپنے خدا کی بندگی کرے اور خداوند کے جو احکام اور آئین میں تجھ کو آج بتاتا ہوں ان پر عمل کرے تاکہ تیری خیر ہو ۔ دیکھ آسمان اور زمین اور جو کچھ زمین میں ہے یہ سب خداوند تیرے خدا ہی کا ہے ۔" (باب ۱۰ - آیات ۱۲ - ۱۴)

" اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات کو جانفشانی سے مان کر اس کے ان سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھے دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا دنیا کی سب قوموں سے زیادہ تجھ کو سرفراز کرے گا ۔ اور اگر تو خداوند اپنے خدا کی بات سنے تو یہ سب برکتیں تجھ پر نازل ہوں گی اور تجھ کو ملیں گی ۔ شہر میں بھی تو مبارک ہوگا اور کھیت میں بھی مبارک ۔ . . . . خداوند تیرے دشمنوں کو جو تجھ پر حملہ کریں تیرے روبرو شکست دلائے گا . . . . . خداوند تیرے انبار خانوں میں اور سب کاموں میں جن میں تو ہاتھ ڈالے برکت کا حکم دیگا . . . . . تجھ کو اپنی پاک قوم بنا کر رکھے گا اور

(باقی ص ۲۷۱ پر)

کیا نہیں اُن قوموں کے حالات نہیں پہنچے جو تم سے پہلے گذر چکی ہیں؟ قوم نوح، عاد، ثمود اور ان کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۰) دنیا کی سب قومیں یہ دیکھ کر کہ تو خداوند کے نام سے کہلاتا ہے تجھ سے ڈر جائیں گی۔ تو بہت سی قوموں کو قرض دیگا پر خود قرض نہیں لیگا اور خداوند تجھ کو دم نہیں بلکہ سر ٹھیرائے گا اور تو پست نہیں بلکہ سرفراز ہی رہیگا۔" (باب ۲۸ - آیات ۱-۱۳)

"لیکن اگر تو ایسا نہ کرے کہ خداوند اپنے خدا کی بات سن کر اس کے سب احکام اور آئین پر جو آج کے دن میں تجھ کو دیتا ہوں احتیاط سے عمل کرے تو یہ سب لعنتیں تجھ پر ہونگی اور تجھ کو لگیں گی شہر میں بھی تو لعنتی ہوگا اور کھیت میں بھی لعنتی ..... خداوند اُن سب کاموں میں جن کو تو ہاتھ لگائے لعنت اور پھٹکار اور اضطراب کو تجھ پر نازل کریگا ..... وبا تجھ سے لپٹی رہے گی .... آسمان جو تیرے سر پر ہے پیتل کا اور زمین جو تیرے نیچے ہے لوہے کی ہو جائے گی .... خداوند تجھ کو تیرے دشمنوں کے آگے شکست دلائیگا۔ تو ان کے مقابلہ کے لئے تو ایک ہی راستہ سے جائیگا مگر ان کے سامنے سات سات راستوں سے بھاگے گا .... عورت سے منگنی تو تو کریگا لیکن دوسرا اس سے مباشرت کریگا۔ تو گھر بنائیگا لیکن اس میں بسنے نہ پائے گا۔ تو تاکستان لگائیگا پر اس کا پھل نہ کھا سکے گا۔ تیرا بیل تیری آنکھوں کے سامنے ذبح کیا جائیگا ...... بھوکا اور پیاسا اور ننگا اور سب چیزوں کا محتاج ہو کر تو اپنے ان دشمنوں کی خدمت کریگا جن کو خداوند تیرے برخلاف بھیجے گا اور غنیم تیری گردن پر لوہے کا جوا رکھے گا جب تک وہ تیرا ناس نہ کر دے ..... خداوند تجھ کو زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تمام قوموں میں پراگندہ کر دیگا۔" (باب ۲۸ - آیات ۱۵-۶۴)

(حاشیہ ۱ صفحہ سابق) اس جگہ حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کے معاملہ کی طرف یہ مختصر اشارہ کرنے سے مقصود اہلِ مکہ کو یہ بتانا ہے کہ اللہ جب کسی قوم پر احسان کرتا ہے اور جواب میں وہ قوم نمک حرامی اور سرکشی دکھاتی ہے تو پھر ایسی قوم کو وہ عبرتناک انجام دیکھنا پڑتا ہے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے بنی اسرائیل دیکھ رہے ہیں۔ اب کیا تم بھی خدا کی نعمت اور اس کے احسان کا جواب کفرانِ نعمت سے دیکر یہی انجام دیکھنا چاہتے ہو؟

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جس نعمت کی قدر کرنے کا یہاں قریش سے مطالبہ (باقی صفحہ ۲۷۲ پر)

بعد آنے والی وہ بہت سی قومیں جن کا شمار اللہ ہی کو معلوم ہے؟ ان کے رسول جب ان کے پاس صاف صاف باتیں اور کھلی کھلی نشانیاں لئے ہوئے آئے تو انہوں نے اپنے منہ میں ہاتھ دبا لئے[1] اور کہا کہ "جس پیغام کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ہم اس کو نہیں مانتے اور جس چیز کی تم ہمیں دعوت دیتے ہو اس کی طرف سے ہم سخت خلجان آمیز شک میں پڑے ہوئے ہیں"[2]۔ رسولوں نے کہا "کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے؟[3] وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۱) فرما رہا ہے وہ خصوصیت کے ساتھ اس کی یہ نعمت ہے کہ اس نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے درمیان پیدا کیا اور آپ کے ذریعہ سے ان کے پاس وہ عظیم الشان تعلیم بھیجی جس کے متعلق حضور بار بار قریش سے فرمایا کرتے تھے کہ کلمۃ واحدۃ تعطونیہا تملکون بہا العرب وتدین لکم بہا العجم "میری ایک بات مان لو، عرب اور عجم سب تمہارے تابع ہو جائیں گے"۔

[1] ان الفاظ کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان بہت کچھ اختلاف پیش آیا ہے اور مختلف لوگوں نے مختلف معنی بیان کئے ہیں ہمارے نزدیک ان کا قریب ترین مفہوم وہ ہے جسے ادا کرنے کے لئے ہم اردو میں کہتے ہیں کانوں پر ہاتھ رکھے، یا دانتوں میں انگلی دبائی۔ اس لئے کہ بعد کا فقرہ صاف طور پر انکار اور اچنبھے، دونوں مضامین پر مشتمل ہے اور کچھ اسمیں غصے کا انداز بھی ہے۔

[2] یعنی ایسا شک جس کی وجہ سے اطمینان رخصت ہو گیا ہے۔ یہ دعوتِ حق کا خاصہ ہے کہ جب وہ اٹھتی ہے تو اس کی وجہ سے ایک کھلبلی ضرور مچ جاتی ہے اور انکار و مخالفت کرنے والے بھی پورے اطمینان کے ساتھ نہ اس کا انکار کر سکتے ہیں نہ اسکی مخالفت۔ وہ چاہے کتنی ہی شدت کے ساتھ اسے رد کریں اور کتنا ہی زور اس کی مخالفت میں لگائیں، دعوت کی سچائی، اسکی معقول دلیلیں، اس کی کھری کھری اور بے لاگ باتیں، اس کی دل موہ لینے والی زبان، اس کے داعی کی بے داغ سیرت، اس پر ایمان لانے والوں کی زندگیوں کا صریح انقلاب اور اپنے صدق مقال کے عین مطابق ان کے پاکیزہ اعمال، یہ ساری چیزیں مل جل کر کٹے سے کٹے مخالف کے دل میں بھی ایک اضطراب پیدا کر دیتی ہیں۔ داعیانِ حق کو بے چین کرنے والا خود بھی چین سے محروم ہو جاتا ہے۔

[3] رسولوں نے یہ بات اس لئے کہی کہ ہر زمانے کے مشرکین خدا کی ہستی کو مانتے تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ زمین اور آسمانوں کا خالق وہی ہے۔ اسی بنیاد پر رسولوں نے فرمایا کہ آخر تمہیں شک کس چیز میں ہے؟ ہم جس چیز کی طرف تمہیں دعوت دیتے ہیں وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ اللہ فاطر السموٰت والارض تمہاری بندگی کا حقیقی مستحق ہے۔ پھر کیا اللہ کے بارے میں تم کو شک ہے؟

تمہیں بلا رہا ہے تاکہ تمہارے قصور معاف کرے اور تم کو ایک مدتِ مقرر تک مہلت دے[1]۔" انہوں نے جواب دیا "تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان جیسے ہم ہیں[2]۔ تم ہمیں ان ہستیوں کی بندگی سے روکنا چاہتے ہو جن کی بندگی باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے۔ اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند[3]۔" رسولوں نے کہا "واقعی ہم کچھ نہیں ہیں مگر تم ہی جیسے انسان۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے[4]۔ اور یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی سند لا دیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے آ سکتی ہے اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

---

[1] مدتِ مقرر سے مراد افراد کی موت کا وقت بھی ہو سکتا ہے اور قیامت بھی۔ جہاں تک قوموں کا تعلق ہے ان کے اٹھنے اور گرنے کے لئے اللہ کے ہاں مدت کا تعین ان کے اوصاف کی شرط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے۔ ایک اچھی قوم اگر اپنے اندر بگاڑ پیدا کرلے تو اس کی مہلتِ عمل گھٹا دی جاتی ہے اور اسے تباہ کر دیا جاتا ہے۔ اور ایک بگڑی ہوئی قوم اگر اپنے برے اوصاف کو اچھے اوصاف سے بدل لے تو اس کی مہلتِ عمل بڑھا دی جاتی ہے حتیٰ کہ قیامت تک بھی دراز ہو سکتی ہے۔ اسی مضمون کی طرف وہ آیت اشارہ کرتی ہے جو سورۂ رعد رکوع ۲ میں گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اوصاف کو نہ بدل دے۔

[2] ان کا مطلب تھا کہ تم ہر حیثیت سے بالکل ہم جیسے انسان ہی نظر آتے ہو۔ کھاتے ہو، پیتے ہو، سوتے ہو، بیوی بچے رکھتے ہو۔ بھوک، پیاس، بیماری، دکھ، سردی، گرمی، ہر چیز کے احساس ہیں۔ وہ ہر شے ہی کمزوری میں ہمارے مشابہ ہو۔ تمہارے اندر کوئی غیر معمولی پن بھی نظر نہیں آتا جس کی بنا پر ہم یہ مان لیں کہ تم کوئی پہنچے ہوئے لوگ ہو اور خدا تم سے ہم کلام ہوتا ہے اور فرشتے تمہارے پاس آتے ہیں۔

[3] یعنی کوئی ایسی سند جسے ہم آنکھوں سے دیکھیں اور ہاتھوں سے چھوئیں اور جس سے ہم کو یقین آ جائے کہ واقعی خدا نے تم کو بھیجا ہے اور یہ پیغام جو تم لائے ہو خدا ہی کا پیغام ہے۔

[4] یعنی بلاشبہ ہم ہیں تو انسان ہی، مگر اللہ نے تمہارے درمیان ہم کو ہی علمِ حق اور بصیرتِ کاملہ عطا کرنے کے لئے منتخب کیا ہے۔ اس میں ہمارے بس کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو اللہ کے اختیارات کا معاملہ ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو جو کچھ چاہے دے۔ ہم نہ یہ کر سکتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے پاس آیا ہے وہ تمہارے پاس بھی بھیج دیں اور نہ یہ کر سکتے ہیں کہ جو حقیقتیں ہم پر منکشف ہوئی ہیں ان سے آنکھیں بند کر لیں۔

اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جبکہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے؟ جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسا کرنے والوں کا بھروسا اللہ ہی پر ہونا چاہیے۔ ع آخرکار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ "یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا[18] ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے۔"[19] تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ "ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے۔[20] یہ انعام ہے اس کا جو میرے حضور جوابدہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو۔" انہوں نے فیصلہ چاہا تھا (تو یوں ان کا فیصلہ ہوا) اور ہر جبار دشمن حق نے منہ کی کھائی۔[21] پھر اس کے بعد آگے اس کے لیے جہنم ہے۔ وہاں اسے کچ لہو کا سا پانی پینے کو دیا جائیگا جسے وہ زبردستی حلق سے اتارنے کی کوشش کریگا اور مشکل ہی سے اتار سکے گا۔ موت ہر طرف سے اس پر چھائی رہے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا اور آگے ایک سخت عذاب اس کی جان کا لاگو رہے گا۔

جن لوگوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے ان کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی

---

[18] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے اپنی گمراہ قوموں کی ملت میں شامل ہوا کرتے تھے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت سے پہلے چونکہ وہ ایک طرح کی خاموش زندگی بسر کرتے تھے، کسی دین کی تبلیغ اور کسی رائج الوقت دین کی تردید نہیں کرتے تھے، اس لئے ان کی قوم یہ سمجھتی تھی کہ وہ ہماری ہی ملت میں ہیں۔ اور نبوت کا کام شروع کر دینے کے بعد ان پر یہ الزام لگایا جاتا تھا کہ وہ ملت آبائی سے نکل گئے ہیں۔ حالانکہ وہ نبوت سے پہلے بھی کبھی مشرکین کی ملت میں شامل نہ ہوئے تھے کہ اس خروج کا الزام ان پر لگ سکتا۔

[19] یعنی گھبراؤ نہیں، یہ کہتے ہیں کہ تم اس ملک میں نہیں رہ سکتے، مگر ہم کہتے ہیں کہ اب یہ اس سرزمین میں نہ رہنے پائیں گے۔ اب تو جو تمہیں ماننے گا وہی یہاں رہے گا۔

[20] ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں اس تاریخی بیان کے پیرایہ میں دراصل کفار مکہ کو ان باتوں کا جواب دیا جا رہا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے۔ ذکر بظاہر پچھلے انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات کا ہے مگر چسپاں ہو رہا ہے وہ ان حالات پر جو اس سورہ کے زمانہ نزول میں پیش آ رہے تھے۔

دن کی آندھی نے اڑا دیا ہو۔ وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پا سکیں گے[۱] یہی پرلے درجے کی گم گشتگی ہے۔
کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے آسمان و زمین کی تخلیق کو حق پر قائم کیا ہے[۲]؟ وہ چاہے تو تم لوگوں کو لے جائے

[۱] یعنی جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ نمک حرامی، بے وفائی، خود مختاری اور نافرمانی و سرکشی کی روش اختیار کی، اور اطاعت و بندگی کا وہ طریقہ اختیار کرنے سے انکار کر دیا جس کی دعوت انبیاء علیہم السلام لے کر آتے ہیں، ان کا پورا کارنامۂ حیات، اور زندگی بھر کا سارا سرمایۂ عمل، آخرکار ایسا لا حاصل اور بے معنی ثابت ہوگا جیسے ایک راکھ کا ڈھیر تھا جو اکٹھا ہو ہو کر مدت دراز میں بڑا بھاری ٹیلہ سا بن گیا تھا، مگر صرف ایک ہی دن کی آندھی نے اس کو ایسا اڑا دیا کہ اس کا ایک ایک ذرہ منتشر ہو کر رہ گیا۔ ان کی نظر فریب تہذیب، ان کا شاندار تمدن، ان کی حیرت انگیز صنعتیں، ان کی زبردست سلطنتیں، ان کی عالیشان یونیورسٹیاں ان کے علوم و فنون اور ادب لطیف و کثیف کے اتھاہ ذخیرے، حتیٰ کہ ان کی عبادتیں اور ان کی ظاہری نیکیاں اور ان کے بڑے بڑے خیراتی اور رفاہی کارنامے بھی، جن پر وہ دنیا میں فخر کرتے ہیں، سب کے سب آخرکار راکھ کا ایک ڈھیر ہی ثابت ہوں گے جسے یوم قیامت کی آندھی بالکل صاف کر دے گی اور عالم آخرت میں اس کا ایک ذرہ بھی ان کے پاس اس لائق نہ رہے گا کہ اسے خدا کی میزان میں رکھ کر کچھ بھی وزن پا سکیں۔

[۲] یہ دلیل ہے اس دعوے کی جو اوپر کیا گیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس بات کو سن کر تمہیں تعجب کیوں ہوتا ہے؟ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ یہ زمین و آسمان کا عظیم الشان کارخانہ تخلیق حق پر قائم ہوا ہے نہ کہ باطل پر؟ یہاں جو چیز حقیقت اور واقعیت پر مبنی نہ ہو بلکہ محض ایک بے اصل قیاس و گمان پر جس کی بنا رکھ دی گئی ہو اسے کوئی پائیداری نصیب نہیں ہو سکتی، اس کے لیے قرار و ثبات کا کوئی امکان نہیں ہے، اس کے اعتماد پر کام کرنے والا کبھی اپنے اعتماد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جو شخص پانی پر نقش بنائے اور ریت پر قصر تعمیر کرے وہ اگر یہ امید رکھتا ہے کہ اس کا نقش باقی رہے گا اور اس کا قصر کھڑا رہے گا تو اس کی یہ امید کبھی پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ پانی کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ نقش قبول کرے اور ریت کی یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ عمارتوں کے لیے مضبوط بنیاد بن سکے۔ لہٰذا سچائی اور حقیقت کو نظر انداز کر کے جو شخص باطل امیدوں پر اپنے عمل کی بنیاد رکھے اسے ناکام ہونا ہی چاہیے۔ یہ بات اگر تمہاری سمجھ میں آتی ہے تو پھر یہ سن کر تمہیں (باقی صفحہ ۲۷۶ پر)

اور ایک نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے۔ ایسا کرنا اس پر کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔

اور یہ لوگ جب اکٹھے اللہ کے سامنے بے نقاب ہوں گے تو اس وقت ان میں سے جو دنیا میں کمزور تھے وہ

(بقیہ حاشیہ ۲۵) حیرت کس لئے ہوتی ہے کہ خدا کی اس کائنات میں جو شخص اپنے آپ کو خدا کی بندگی و اطاعت سے آزاد فرض کر کے کام کریگا، یا خدا کے سوا کسی اور کی خدائی مان کر (جس کی فی الواقع خدائی نہیں ہے) زندگی بسر کریگا، اس کا پورا کارنامۂ زندگی ضائع ہو جائیگا۔ جب واقعہ یہ نہیں ہے کہ انسان یہاں خود مختار ہو یا خدا کے سوا کسی اور کا بندہ ہو، تو اس مجبوط پر اس خلاف واقعہ مفروضے پر اپنے پورے نظام فکر و عمل کی بنیاد رکھنے والا انسان تمہاری رائے میں پانی پر نقش کھینچنے والے احمق کا سا انجام نہ دیکھے گا تو اس کے لئے اور کس انجام کی تم توقع رکھتے ہو؟

۲۶ دعوے پر دلیل پیش کرنے کے بعد فوراً ہی یہ فقرہ نصیحت کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے اور ساتھ ساتھ اس میں ایک شبہ کا ازالہ بھی ہے جو اوپر کی دو ٹوک بات سن کر آدمی کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک شخص پوچھ سکتا ہے کہ اگر بات وہی ہے جو ان آیتوں میں فرمائی گئی ہے تو یہاں ہر باطل پرست اور غلط کار آدمی فنا کیوں نہیں ہو جاتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نادان! کیا تو سمجھتا ہے کہ اُسے فنا کر دینا اللہ کے لئے کچھ دشوار ہے؟ یا اللہ سے اس کا کوئی رشتہ ہے کہ اُس کی شرارتوں کے باوجود اللہ نے محض اقربا پروری کی بنا پر اسے مجبوراً چھوٹ دے رکھی ہو؟ اگر یہ بات نہیں ہے، اور تو خود جانتا ہے کہ نہیں ہے، تو پھر تجھے سمجھنا چاہئے کہ ایک باطل پرست اور غلط کار قوم ہر وقت اس خطرے میں مبتلا ہے کہ اسے ہٹا دیا جائے اور کسی دوسری قوم کو اس کی جگہ کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس خطرے کے عملاً رونما ہونے میں اگر دیر لگ رہی ہے تو اس غلط فہمی کے نشے میں مست نہ ہو جاؤ کہ خطرہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ مہلت کے ایک ایک لمحہ کو غنیمت جانو اور اپنے باطل نظام فکر و عمل کی ناپائیداری کو محسوس کر کے اسے جلدی سے جلدی پائیدار بنیادوں پر قائم کر لو۔

۲۷ بَرَزُوْا کے معنی محض نکل کر سامنے آنے اور پیش ہونے ہی کے نہیں ہیں بلکہ اس میں ظاہر ہونے اور کھل جانے کا مفہوم بھی شامل ہے، اسی لئے ہم نے اس کا ترجمہ بے نقاب ہو کر سامنے آ جانا کیا ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے تو بندے ہر وقت اپنے رب کے سامنے بے نقاب ہیں، مگر آخرت کی پیشی کے دن جب یہ سب کے سب اللہ کی عدالت میں حاضر ہونگے تو انہیں خود بھی معلوم ہوگا کہ ہم اس احکم الحاکمین و مالک یوم الدین کے سامنے بالکل بے نقاب ہیں، ہمارا کوئی کام بلکہ کوئی خیال اور دل کے گوشوں میں چھپا ہوا کوئی ارادہ تک اس سے مخفی نہیں ہے۔

اُن لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کہیں گے "دنیا میں ہم تمہارے تابع تھے، اب کیا تم اللہ کے عذاب سے ہم کو بچانے کے لئے بھی کچھ کر سکتے ہو؟" وہ جواب دیں گے "اگر اللہ نے ہمیں نجات کی کوئی راہ دکھائی ہوتی تو ہم ضرور تمہیں بھی دکھا دیتے۔ اب تو یکساں ہے، خواہ ہم جزع فزع کریں یا صبر، بہرحال ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔"[1] ع

ع

اور جب فیصلہ چکا دیا جائیگا تو شیطان کہے گا "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جو وعدے تم سے کئے تھے وہ سب سچے تھے اور میں نے جتنے وعدے کئے اُن میں سے کوئی بھی پورا نہ کیا۔[2] میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تمہیں دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔[3]

---

[1] یہ تنبیہ ہے اُن سب لوگوں کیلئے جو دنیا میں آنکھیں بند کرکے دوسروں کے پیچھے چلتے ہیں، یا اپنی کمزوری کو حجت بناکر طاقتور ظالموں کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ آج جو تمہارے لیڈر اور پیشوا اور افسر اور حاکم بنے ہوئے ہیں، کل ان میں سے کوئی بھی تمہیں خدا کے عذاب سے ذرہ برابر بھی نہ بچا سکے گا۔ لہٰذا آج ہی سوچ لو کہ تم جس کے پیچھے چل رہے ہو یا جس کا حکم مان رہے ہو وہ خود کہاں جا رہا ہے اور تمہیں کہاں پہنچا کر چھوڑیگا۔

[2] یعنی تمہارے تمام گلے شکوے اِس حد تک تو بالکل صحیح ہیں کہ اللہ سچا تھا اور میں جھوٹا تھا۔ اس واقعہ سے مجھے ہرگز انکار نہیں ہے۔ اللہ کے وعدے اور اس کی وعیدیں، تم دیکھ ہی رہے ہو کہ ان میں سے ہر بات جوں کی توں سچی نکلی۔ اور میں خود مانتا ہوں کہ جو بھروسے میں نے تمہیں دلائے، جن فائدوں کے لالچ تمہیں دیئے، جن خوشنما توقعات کے جال میں تمہیں پھانسا، اور سب سے بڑھ کر یہ یقین جو تمہیں دلایا کہ اوّل تو آخرت واخرت کچھ بھی نہیں ہے، سب محض ڈھکوسلا ہے، اور اگر ہوئی بھی تو فلاں حضرت کے تصدق سے تم صاف بچ نکلوگے، بس اُن کی خدمت میں نذر و نیاز کی رشوت پیش کرتے رہو اور پھر جو چاہو کرتے پھرو، نجات کا ذمہ ان کا، یہ ساری باتیں جو میں تم سے کہتا رہا اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ سے کہلواتا رہا، یہ سب کچھ محض دھوکا تھا۔

[3] یعنی اگر آپ حضرات یہ ثابت کر سکتے ہوں کہ آپ خود راہِ راست پر چلنا چاہتے تھے اور میں نے زبردستی آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کو غلط راستے پر کھینچ لیا، تو ضرور اسے پیش فرمائیے، جو چور کی سزا سو میری۔ لیکن آپ خود مانیں گے کہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ باقی صفحہ ۲۲ پر

اب مجھے ملامت نہ کرو اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری فریاد رسی کرسکتا ہوں اور نہ تم میری۔ اس سے پہلے جو تم نے مجھے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا میں اس سے بری الذمہ ہوں، ایسے ظالموں کے لئے تو دردناک سزا یقینی ہے۔

(تفہیم حاشیہ ۳۲)۔ خود مانیں گے کہ واقعہ یہ نہیں ہے؟ میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ دعوت حق کے مقابلہ میں اپنی دعوت باطل آپ کے سامنے پیش کی، سچائی کے مقابلہ میں جھوٹ کی طرف آپ کو بلایا، نیکی کے مقابلہ میں بدی کی طرف آپ کو پکارا۔ ماننے اور نہ ماننے کے جملہ اختیارات آپ ہی حضرات کو حاصل تھے۔ میرے پاس آپ کو مجبور کرنے کی کوئی طاقت نہ تھی۔ اب اپنی اس دعوت کا ذمہ دار تو بلاشبہ میں خود ہوں اور اس کی سزا بھی پا رہا ہوں۔ مگر آپ نے جو اس پر لبیک کہا اس کی ذمہ داری آپ مجھ پر کہاں ڈالنے چلے ہیں۔ اپنے غلط انتخاب اور اپنے اختیار کے غلط استعمال کی ذمہ داری تو آپ کو خود ہی اٹھانی چاہیئے۔

لو یہاں پھر شرک اعتقادی کے علاوہ شرک کی ایک دوسری مستقل نوع یعنی شرک عملی کے وجود کا ایک ثبوت ملتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ شیطان کو اعتقادی حیثیت سے تو کوئی بھی خدائی میں شریک نہیں ٹھیراتا ہے اور نہ اس کی پرستش کرتا ہے۔ سب اس پر لعنت ہی بھیجتے ہیں۔ البتہ اس کی اطاعت اور غلامی اور اس کے طریقے کی اندھی یا آنکھوں دیکھے پیروی ضرور کی جا رہی ہے، اور اسی کو یہاں شرک کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کوئی صاحب جواب میں فرمائیں کہ یہ تو شیطان کا قول ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے لیکن ہم عرض کریں گے کہ اول تو اس کے قول کی اللہ تعالیٰ خود تردید فرما دیتا اگر وہ غلط ہوتا۔ دوسرے شرک عملی کا صرف یہی ایک ثبوت قرآن میں نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد ثبوت پچھلی صورتوں میں گزر چکے ہیں اور آگے آ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ الزام کہ وہ اپنے احبار اور رہبان کو ارباباً من دون اللہ بنائے ہوئے ہیں (آل عمران۔ رکوع ۷)، جاہلیت کی رسمیں ایجاد کرنے والوں کے متعلق یہ کہنا کہ ان کے پیروؤں نے انہیں خدا کا شریک بنا رکھا ہے (الانعام۔ رکوع ۱۶)، خواہش نفس کی بندگی کرنے والوں کے متعلق یہ فرمانا کہ انہوں نے اپنی خواہش نفس کو خدا بنا لیا ہے (الفرقان رکوع ۴)، نافرمان بندوں کے متعلق یہ ارشاد کہ وہ شیطان کی عبادت کرتے رہے ہیں (یٰس۔ رکوع ۴) اور انسانی ساخت کے قوانین پر چلنے والوں کو ان الفاظ میں ملامت کہ اذن خداوندی کے بغیر جن لوگوں نے تمہارے لئے شریعت بنائی ہے وہ تمہارے "شریک" ہیں (الشوریٰ۔ رکوع ۳)۔ کیا یہ سب اسی شرک عملی کی نظیریں نہیں ہیں جس کا [illegible]

بخلاف اس کے جو لوگ دنیا میں ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں وہ ایسے باغوں میں داخل کئے جائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی۔ وہاں وہ اپنے رب کے اذن سے ہمیشہ رہیں گے، اور وہاں ان کا استقبال سلامتی کی مبارکباد سے ہوگا[۱]۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کلمۂ طیبہ[۲] کو کس چیز سے مثال دی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اچھی ذات کا درخت، جس کی جڑ زمین میں گہری جمی ہوئی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۷۸) یہاں ذکر ہو رہا ہے؟ ان تفسیروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ کوئی شخص عقیدۃً کسی غیر اللہ کو خدائی میں شریک ٹھیرائے۔ اس کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہے کہ وہ خدائی سند کے بغیر، یا احکام خداوندی کے علی الرغم، اس کی پیروی اور اطاعت کرتا چلا جائے۔ ایسا پیرو اور مطیع اگر اپنے پیشوا اور مطاع پر لعنت بھیجتے ہوئے بھی عملاً یہ روش اختیار کر رہا ہو تو قرآن کی رو سے وہ اس کو خدائی میں شریک بنائے ہوئے ہے، چاہے شرعاً اس کا حکم بالکل وہی نہ ہو جو اعتقادی مشرکین کا ہے۔

[۱] تحیّہ کے لغوی معنی ہیں دعائے درازیٔ عمر۔ مگر اصطلاحاً عربی زبان میں یہ لفظ اس کلمۂ خیر مقدم یا کلمۂ استقبال کے لئے بولا جاتا ہے جو دو آدمی آمنا سامنا ہونے پر سب سے پہلے ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ اردو میں اس کا ہم معنی لفظ یا تو "سلام" ہے، یا پھر علیک سلیک۔ لیکن پہلا لفظ استعمال کرنے سے ترجمہ ٹھیک نہیں ہوتا، اور دوسرا لفظ مبتذل ہے، اس لئے ہم نے اس کا ترجمہ "استقبال" کیا ہے۔

تحیّتھم کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کے درمیان آپس میں ایک دوسرے کے استقبال کا طریقہ یہ ہوگا اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ان کا اس طرح استقبال ہوگا۔ نیز سَلَامٌ میں دعائے سلامتی کا مفہوم بھی ہے اور سلامتی کی مبارکباد کا بھی۔ ہم نے موقع کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے وہ مفہوم اختیار کیا ہے جو ترجمہ میں درج ہے۔

[۲] کلمۂ طیبہ کے لفظی معنی ہیں "پاکیزہ بات" کے ہیں، مگر اس سے مراد ہے قول حق اور عقیدۂ صالحہ جو سراسر حقیقت اور راستی پر مبنی ہو۔ یہ قول اور عقیدہ قرآن مجید کی رو سے لازماً وہی ہو سکتا ہے جس میں توحید کا اقرار، انبیاء اور کتب آسمانی کا اقرار، اور آخرت کا اقرار ہو، کیونکہ قرآن انہی امور کو بنیادی صداقتوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے

اور شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں، ہر آن وہ اپنے رب کے حکم سے اپنے پھل دے رہا ہے۔ یہ مثالیں اللہ اس لئے دیتا ہے کہ لوگ ان سے سبق لیں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایک بدذات درخت کی سی ہے جو زمین کی سطح سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے، اس کے لئے کوئی استحکام نہیں ہے۔ ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قولِ ثابت

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ زمین سے لیکر آسمان تک چونکہ سارا نظام کائنات اُسی حقیقت پر مبنی ہے جس کا اقرار ایک مومن اپنے کلمۂ طیبہ میں کرتا ہے، اس لئے کسی گوشے میں بھی قانونِ فطرت اس سے نہیں ٹکراتا، کسی شے کی بھی اصل اور جبلت اس سے اِبا نہیں کرتی، کہیں کوئی حقیقت اور صداقت اس سے متصادم نہیں ہوتی۔ اسی لئے زمین اور اس کا پورا نظام اس سے تعاون کرتا ہے، اور آسمان اور اس کا پورا عالم اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔

یعنی وہ ایسا بارآور اور نتیجہ خیز کلمہ ہے کہ جو شخص یا قوم اسے بنیاد بنا کر اپنی زندگی کا نظام اس پر تعمیر کرے، اس کو ہر آن اُس کے مفید نتائج حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ وہ فکر میں سلجھاؤ، طبیعت میں سلامت، مزاج میں اعتدال، سیرت میں مضبوطی، اخلاق میں پاکیزگی، روح میں لطافت، جسم میں طہارت و نظافت، برتاؤ میں خوشگواری، معاملات میں راست بازی، کلام میں صداقت شعاری، قول و قرار میں پختگی، معاشرت میں حسنِ سلوک، تہذیب میں فضیلت، تمدن میں توازن، معیشت میں عدل و مواساۃ، سیاست میں دیانت، جنگ میں شرافت، صلح میں خلوص اور عہد و پیمان میں وثوق پیدا کرتا ہے۔ وہ ایک ایسا پارس ہے جس کی تاثیر اگر کوئی ٹھیک ٹھیک قبول کرے تو کندن بن جائے۔

یہ لفظ کلمۂ طیبہ کی ضد ہے جس کا اطلاق اگرچہ ہر خلافِ حقیقت اور مبنی بر غلط قول پر ہو سکتا ہے، مگر یہاں اس سے مراد ہر وہ باطل عقیدہ ہے جس کو انسان اپنے نظامِ زندگی کی بنیاد بنائے، عام اس سے کہ وہ دہریت ہو، الحاد و زندقہ ہو، شرک و بت پرستی ہو، یا کوئی اور ایسا تخیل جو انبیاء کے واسطے سے نہ آیا ہو۔

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ عقیدۂ باطل چونکہ حقیقت کے خلاف ہے اس لئے قانونِ فطرت کہیں بھی اس سے موافقت نہیں کرتا۔ کائنات کا ہر ذرہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔ (باقی ص ۲۸۲ پر)

کی بنیاد پر دنیا اور آخرت، دونوں میں ثبات عطا کرتا ہے، اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے۔ اللہ کو اختیار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۰) زمین و آسمان کی ہر شے اس کی تردید کرتی ہے۔ زمین میں اس کا بیج بونے کی کوشش کی جائے تو ہر وقت وہ اسے اگلنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ آسمان کی طرف اس کی شاخیں بڑھنا چاہیں تو وہ انہیں نیچے دھکیلتا ہے۔ انسان کو اگر امتحان کی خاطر انتخاب کی آزادی اور عمل کی مہلت نہ دی گئی ہوتی تو یہ بدذات درخت کہیں لگنے ہی نہ پاتا۔ مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کو اپنے رجحان کے مطابق کام کرنے کا موقع عطا کیا ہے، اس لئے نادان لوگ قانونِ فطرت سے لڑ بھڑ کر یہ درخت لگانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے زور مارنے سے زمین اسے تھوڑی بہت جگہ دے دیتی ہے، ہوا اور پانی سے کچھ نہ کچھ غذا بھی اسے مل جاتی ہے، اور فضا بھی اس کی شاخوں کو پھیلنے کے لئے بادلِ ناخواستہ کچھ موقع دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ لیکن جب تک یہ درخت قائم رہتا ہے کڑوے کسیلے، زہریلے پھل دیتا رہتا ہے، اور حالات کے بدلتے ہی حوادث کا ایک جھٹکا اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔

کلمۂ طیبہ اور کلماتِ خبیثہ کے اس فرق کو ہر وہ شخص بآسانی محسوس کر سکتا ہے جو دنیا کی مذہبی، اخلاقی، فکری اور تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرے۔ وہ دیکھے گا کہ آغازِ تاریخ سے آج تک کلمۂ طیبہ تو ایک ہی رہا ہے، مگر کلماتِ خبیثہ بے شمار پیدا ہو چکے ہیں۔ کلمۂ طیبہ کبھی جڑ سے نہ اکھاڑا جا سکا، مگر کلماتِ خبیثہ کی فہرست ہزاروں مردہ کلمات کے ناموں سے بھری پڑی ہے۔ حتیٰ کہ ان میں سے بہتوں کا یہ حال ہے کہ آج تاریخ کے صفحات کے سوا کہیں ان کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ اپنے زمانے میں جن کلمات کا بڑا زور شور رہا ہے آج ان کا ذکر سن کر لوگ حیران رہ جائیں کہ کبھی انسان ایسی ایسی حماقتوں کا بھی قائل رہ چکا ہے۔ پھر کلمۂ طیبہ کو جب جہاں جس شخص یا قوم نے بھی صحیح معنوں میں اپنایا اس کی خوشبو سے اس کا ماحول معطر ہو گیا اور اس کی برکتوں سے صرف اسی نے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس کے گرد و پیش کی دنیا بھی ان سے مالا مال ہو گئی۔ مگر کسی کلمۂ خبیثہ نے جہاں جس انفرادی یا اجتماعی زندگی میں بھی جڑ پکڑی اس کی سڑاند سے سارا ماحول متعفن ہو گیا اور اس کے کانٹوں کی چبھن سے نہ اس کا ماننے والا امن میں رہا، نہ کوئی ایسا شخص جس کو اس سے سابقہ پیش آیا ہو۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ یہاں تمثیل کے پیرایہ میں اُسی مضمون کو سمجھایا گیا ہے جو

(باقی صفحہ ۲۸۲ پر)

لہ و ٹلہ کا حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں

سے ہے جو چاہے کرے گا۔ ع

تم نے دیکھا اُن لوگوں کو جنہوں نے اللہ کی نعمت پائی اور اسے کفرانِ نعمت سے بدل ڈالا اور اپنے ساتھ

(بقیہ حاشیہ ۲۵ ۔ اوپر آیت ۳۰ میں یوں بیان ہوا تھا کہ "اپنے ربّ سے کفر کرنے والوں کے اعمال کی مثال اس راکھ کی سی ہے جسے ایک طوفانی دن کی آندھی نے اُڑا دیا ہو۔" اور یہی مضمون اس سے پہلے سورۂ رعد رکوع ۲ میں ایک دوسرے انداز سے سیلاب اور پگھلائی ہوئی دھاتوں کی تمثیل میں بیان ہو چکا ہے۔

(حاشیہ ۲۶ صفحہ سابق) یعنی دنیا میں ان کو اس کلمہ کی وجہ سے ایک پائدار نقطۂ نظر، ایک مستحکم نظامِ فکر، اور ایک جامع نظریہ ملتا ہے جو ہر عقدے کو حل کرنے اور ہر گتھی کو سلجھانے کے لئے شاہ کلید کا حکم رکھتا ہے۔ سیرت کی مضبوطی اور اخلاق کی استواری نصیب ہوتی ہے جسے زمانہ کی گردشیں متزلزل نہیں کر سکتیں۔ زندگی کے ایسے ٹھوس اصول ملتے ہیں جو ایک طرف ان کے قلب کو سکون اور دماغ کو اطمینان بخشتے ہیں اور دوسری طرف انہیں سعی و عمل کی راہوں میں بھٹکنے، ٹھوکریں کھانے، اور تلوّن کا شکار ہونے سے بچاتے ہیں۔ پھر جب وہ موت کی سرحد پار کر کے عالمِ آخرت کے حدود میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں کسی قسم کی حیرانی اور سراسیمگی و پریشانی ان کو لاحق نہیں ہوتی کیونکہ وہاں سب کچھ ان کی توقعات کے عین مطابق ہوتا ہے۔ وہ اس عالم میں اس طرح داخل ہوتے ہیں کہ گویا اس کی راہ و رسم سے پہلے ہی واقف تھے۔ وہاں کوئی مرحلہ ایسا پیش نہیں آتا جس کی انہیں پہلے خبر نہ دے دی گئی ہو اور جس کے لئے انہوں نے قبل از وقت تیاری نہ کر رکھی ہو۔ اس لئے وہاں ہر منزل سے وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ گزرتے ہیں۔ ان کا حال وہاں اُس کافر سے بالکل مختلف ہوتا ہے جسے مرتے ہی اپنی توقعات کے سراسر خلاف ایک دوسری ہی صورتِ حال سے اچانک سابقہ پیش آتا ہے۔

(حاشیہ ۲۷ صفحہ سابق)

یعنی جو ظالم کلمۂ طیبہ کو چھوڑ کر کسی کلمۂ خبیثہ کی پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے ذہن کو پراگندہ اور ان کی مساعی کو پریشان کر دیتا ہے۔ وہ کسی پہلو سے بھی فکر و عمل کی صحیح راہ نہیں پا سکتے۔ اُن کا کوئی تیر بھی نشانے پر نہیں بیٹھتا۔

اپنی قوم کو بھی ہلاکت کے گھر میں جھونک دیا ــ یعنی جہنم، جس میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بدترین جائے قرار ہے ــــ اور اللہ کے کچھ ہمسر تجویز کر لیے تاکہ وہ انہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں۔ ان سے کہو، اچھا، مزے کر لو، آخرکار تمہیں پلٹ کر جانا دوزخ ہی میں ہے۔

اے نبی، میرے جو بندے ایمان لائے ہیں ان سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے (راہِ خیر میں) خرچ کریں[۱] قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوست نوازی ہو سکے گی۔[۲]

اللہ وہی تو ہے[۳] جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے تمہاری رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے۔ جس نے کشتی کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا۔ جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات اور دن کو تمہارے لیے مسخر کیا۔[۴] جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم

---

[۱] مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی روش اہلِ کفر کی روش سے مختلف ہونی چاہیے۔ وہ تو کافرِ نعمت ہیں۔ انہیں شکر گزار ہونا چاہیے اور اس شکر گزاری کی عملی صورت یہ ہے کہ نماز قائم کریں اور خدا کی راہ میں اپنے مال خرچ کریں۔

[۲] یعنی نہ تو وہاں کچھ دے دلا کر ہی نجات خریدی جا سکے گی اور نہ کسی کی دوستی کام آئے گی کہ وہ تمہیں خدا کی پکڑ سے بچا لے۔

[۳] یعنی وہ اللہ کی نعمت کا کفران کیا جا رہا ہے، جس کی بندگی و اطاعت سے منہ موڑا جا رہا ہے، جس کے ساتھ زبردستی کے شریک ٹھیرائے جا رہے ہیں وہ وہی تو ہے جس کے یہ اور یہ احسانات ہیں۔

[۴] مسخر کیا کو لوگ غلطی سے "تمہارے تابع کر دیا" کے معنی میں لے لیتے ہیں، اور پھر اس مضمون کی آیات سے عجیب عجیب معنی پیدا کرنے لگتے ہیں، حتیٰ کہ بعض لوگ تو یہاں تک سمجھ بیٹھے کہ ان آیات کی رو سے تسخیرِ سماوات و ارض انسان کا منتہائے مقصود ہے۔ حالانکہ انسان کے لیے ان چیزوں کو مسخر کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے قوانین کا پابند بنا رکھا ہے جن کی بدولت وہ انسان کے لیے نافع ہو گئی ہیں۔ کشتی اگر فطرت کے چند مخصوص قوانین کی پابند نہ ہوتی تو انسان کبھی بحری سفر نہ کر سکتا۔ دریا اگر مخصوص قوانین میں جکڑے ہوئے نہ ہوتے تو کبھی ان سے نہریں نہ نکالی جا سکتیں۔ سورج اور چاند، اور روز و شب اگر ضابطوں میں کسے ہوئے نہ ہوتے تو یہاں زندگی ہی ممکن نہ ہوتی کجا کہ ایک چلتا پھولتا انسانی تمدن وجود میں آ سکتا

سے مانگا[1]۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو کر نہیں سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔ ؏

یاد کرو وہ وقت جب ابراہیم نے دعا کی تھی[2] کہ "پروردگار! اس شہر[3] کو امن کا شہر بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بُت پرستی سے بچا۔ پروردگار! ان بُتوں نے بہتوں کو گمراہی میں ڈالا ہے[4] (ممکن ہے کہ میری اولاد کو بھی یہ گمراہ کر دیں، لہٰذا ان میں سے) جو میرے طریقے پر چلے وہ میرا ہے اور جو میرے خلاف طریقہ اختیار کرے تو یقیناً تو درگزر کرنے والا مہربان ہے[5]۔ پروردگار! میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد

---

[1] یعنی تمہاری فطرت کی ہر مانگ پوری کی، تمہاری زندگی کے لئے جو جو کچھ مطلوب تھا مہیا کیا، تمہارے بقا اور ارتقاء کے لئے جن جن وسائل کی ضرورت تھی سب فراہم کر دیے۔

[2] عام احسانات کا ذکر کرنے کے بعد اب ان خاص احسانات کا ذکر کیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے قریش پر کئے، اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے باپ ابراہیم نے یہاں آکر کن تمناؤں کے ساتھ تمہیں بسایا تھا، اس کی دعاؤں کے جواب میں کیسے کیسے احسانات ہم نے تم پر کئے، اور اب تم اپنے باپ کی تمناؤں اور اپنے رب کے احسانات کا جواب کن گمراہیوں اور بداعمالیوں سے دے رہے ہو۔

[3] یعنی مکہ

[4] یعنی خدا سے پھیر کر اپنا گرویدہ کیا ہے۔ یہ مجازی کلام ہے۔ بُت چونکہ بہتوں کی گمراہی کے سبب بنے ہیں اس لئے گمراہ کرنے کے فعل کو ان کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔

[5] یہ حضرت ابراہیم کی کمال درجہ نرم دلی اور نوعِ انسانی کے حال پر ان کی انتہائی شفقت ہے کہ وہ کسی حال میں انسان کو خدا کے عذاب میں گرفتار ہوتے نہیں دیکھ سکتے بلکہ آخر وقت تک عفو و درگزر کی التجا کرتے رہتے ہیں۔ رزق کے معاملہ میں تو انہوں نے یہاں تک کہہ دینے میں دریغ نہ فرمایا کہ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرہ۔ رکوع ۱۵) لیکن جہاں آخرت کی پکڑ کا سوال آیا وہاں ان کی زبان سے یہ نہ نکلا کہ جو میرے طریقے کے خلاف چلے اسے سزا دے ڈالیو، بلکہ کہا تو یہ کہا کہ ان کے معاملہ میں کیا عرض کروں، تو غفور رحیم ہے۔ اور یہ کچھ اپنی ہی اولاد کے ساتھ اس سراپا رحم و شفقت انسان کا مخصوص رویہ نہیں ہے۔ (باقی ۲۸۵ پر)

کے ایک حصّے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے۔ پروردگار! یہ میں نے اس لئے کیا ہے کہ یہ لوگ یہاں نماز قائم کریں۔ لہٰذا تو لوگوں کے دلوں کو ان کا مشتاق بنا اور ہر طرح کی پیداوار سے ان کو رزق پہنچا شاید[۱] کہ یہ شکرگزار بنیں۔ پروردگار! تو جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں[۲]"——اور واقعی[۳] اللہ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمانوں میں——"شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحٰق جیسے بیٹے دیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے۔ اے میرے پروردگار! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے بھی (ایسے لوگ اٹھا جو یہ کام کریں)۔ پروردگار میری دعا قبول کر۔ پروردگار! مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اُس دن معاف کر دیجیو جبکہ حساب قائم ہوگا[۴]" ع

ع

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۸۴) بلکہ جب فرشتے قوم لوط جیسی بدکار قوم کو تباہ کرنے جا رہے تھے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ بڑی محبت کے انداز میں فرماتا ہے کہ "ابراہیم ہم سے جھگڑنے لگا" (ھود، رکوع ۷)۔ یہی حال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کے روبرو عیسائیوں کی گمراہی ثابت کر دیتا ہے تو وہ عرض کرتے ہیں کہ "اگر حضور ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ بالا دست اور حکیم ہیں" (المائدہ۔ رکوع ۱۶)

[۱] یہ اسی دعا کی برکت ہے کہ پہلے سارا عرب مکہ کی طرف حج اور عمرے کیلئے کھنچ کر آتا تھا، اور اب دنیا بھر کے لوگ کھنچ کھنچ کر وہاں جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی اسی دعا کی برکت ہے کہ ہر زمانے میں ہر طرح کے پھل، غلّے، اور دوسرے سامانِ رزق وہاں پہنچتے رہتے ہیں اور آج بھی پہنچ رہے ہیں، حالانکہ اس وادیٔ غیر ذی زرع میں جانوروں کے لئے چارہ تک پیدا نہیں ہوتا۔

[۲] یعنی خدایا جو کچھ میں زبان سے کہہ رہا ہوں وہ بھی تو سن رہا ہے اور جو جذبات میرے دل میں چھپے ہوئے ہیں ان سے بھی تو واقف ہے۔

[۳] یہ جملہ معترضہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے قول کی تصدیق میں فرمایا ہے۔

[۴] حضرت ابراہیمؑ نے اس دعائے مغفرت میں اپنے باپ کو اُس وعدے کی بنا پر شریک کر لیا تھا جو انہوں نے وطن سے نکلتے وقت کیا تھا کہ سَاَسْتَغْفِرُ لَکَ رَبِّیْ (مریم ع ۳)۔ مگر بعد میں جب انہیں احساس ہوا کہ وہ تو اللہ کا دشمن تھا تو انہوں نے اس سے صاف تبرّی فرما دی (التوبہ ع ۱۴)

اب یہ ظالم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں، اللہ کو تم اس سے غافل نہ سمجھو۔ اللہ تو انہیں ٹال رہا ہے اُس دن کے لئے جب حال یہ ہوگا کہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی ہیں، سر اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں، نظریں اوپر جمی ہیں اور دل اڑے جاتے ہیں۔[۱] اے محمدؐ! اُس دن سے تم انہیں ڈراؤ جبکہ عذاب انہیں آلیگا۔ اُس وقت یہ ظالم کہیں گے کہ "اے ہمارے رب! ہمیں تھوڑی سی مہلت اور دے دے، ہم تیری دعوت کو لبیک کہیں گے اور رسولوں کی پیروی کریں گے" (مگر انہیں صاف جواب دے دیا جائیگا کہ) "کیا تم وہی لوگ نہیں ہو جو اس سے پہلے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم پر تو کبھی زوال آنا ہی نہیں ہے؟ حالانکہ تم اُن قوموں کی بستیوں میں رہ بس چکے تھے جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا تھا اور دیکھ چکے تھے کہ ہم نے ان سے کیا سلوک کیا اور اُن کی مثالیں دے دے کر ہم تمہیں سمجھا بھی چکے تھے۔ انہوں نے اپنی ساری ہی چالیں چل دیکھیں، مگر اُن کی ہر چال کا توڑ اللہ کے پاس تھا اگرچہ ان کی چالیں ایسی غضب کی تھیں کہ پہاڑ ان سے ٹل جائیں۔[۲]

پس اے نبی، تم ہرگز یہ گمان نہ کرو کہ اللہ کبھی اپنے رسولوں سے کئے ہوئے وعدوں کے خلاف کریگا۔[۳] اللہ زبردست ہے اور انتقام لینے والا ہے۔ ڈراؤ انہیں اس دن سے جبکہ زمین اور آسمان بدل کر

---

[۱] یعنی قیامت کا جو ہولناک نظارہ ان کے سامنے ہوگا اس کو اس طرح ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہونگے گویا کہ ان کے دیدے پتھرا گئے ہیں، نہ پلک جھپکے گی، نہ نظر ہٹے گی۔

[۲] یعنی تم یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ تمہاری پیش رو قوموں نے قوانینِ الٰہی کی خلاف ورزی کے نتائج سے بچنے اور انبیاء کی دعوت کو ناکام کرنے کے لئے کیسی کیسی زبردست چالیں چلیں، اور یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ اللہ کی ایک ہی چال سے وہ کس طرح مات کھا گئے، مگر پھر بھی تم حق کے خلاف چالبازیاں کرنے سے باز نہ آئے اور یہی سمجھتے رہے کہ تمہاری چالیں ضرور کامیاب ہونگی۔

[۳] اس جملے میں کلام کا رُخ بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے، مگر دراصل سنانا آپ کے مخالفین کو مقصود ہے۔

(بقیہ اشارات صفحہ ۸) زور سے پہاڑ تک ٹل جائیں گے۔ مگر تھوڑی ہی مدت بعد ثابت ہو گیا کہ شیطان کا مکر بہت ضعیف ہے۔ سال ختم ہوتے ہوتے مسلمانوں کی رائے عام پوری طرح اس مطالبۂ حق پر متفق ہو گئی جو آغاز سال میں پیش کیا گیا تھا، اور مارچ ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی کو طوعاً و کرہاً قرارداد مقاصد پاس کرنی پڑی۔

جماعت اسلامی کو یہ دعویٰ نہیں ہے کہ مطالبے کی یہ مہم سراسر اس کی طاقت سے کامیاب ہوئی ہے۔ بلاشبہ ملک کی تمام اسلامی جماعتوں اور تمام دین پسند عناصر کی قوت اس میں شریک تھی، اور اس میں ان لوگوں کا بھی حصہ تھا جو نہ اس وقت جماعت کے دوست تھے نہ آج ہیں۔ مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جماعت اسلامی ہی اس کی اصل محرک تھی اور اگر یہ منظم طاقت اس کی پشت پر نہ ہوتی تو ان منتشر آوازوں سے جو وقتاً فوقتاً اسلامی نظام کے حق میں اٹھتی رہتی تھیں اس مطالبہ کا ایک باقاعدہ مہم کی شکل اختیار کرنا، اور پھر کامیابی کی منزل تک پہنچنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اس حقیقت کو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جنہوں نے اس مہم کے سلسلے میں کچھ کام کیا ہے اور وہ برسر اقتدار گروہ بھی جانتا ہے جسے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا ہے۔

جو لوگ سیاسی معاملات کا فہم نہیں رکھتے وہ شاید آج تک بھی یہ اندازہ نہیں کر سکے ہیں کہ یہ کس قدر اہم اور ضروری قدم تھا جو جماعت نے اٹھایا اور کس قدر بروقت اٹھایا۔ آج اس کی اہمیت اور اس کے دور رس نتائج ہم بیان بھی کریں تو وہ ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہم اس میں ناکام ہو گئے ہوتے اور یہاں آئینی طور پر لادینی اصولوں کو ریاست کی بنیاد بنانے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا تو ہمارے بھائیوں کو معلوم ہو جاتا کہ یہاں اسلام کے علمبرداروں کا مستقبل کیسا خطرناک ہے۔ اب یہ سراسر اللہ کا فضل ہے کہ کم از کم اس نوزائیدہ ریاست کا دستوری نصب العین تو اسلام کے عین مطابق بن چکا ہے اور آئینی حیثیت سے کفر کے مقابلہ میں اسلام کی پوزیشن مضبوط ہو گئی ہے۔ اس پر مزید فضل یہ ہے کہ رائے عام پوری طرح اس آئینی پوزیشن کی حمایت پر کمربستہ ہے اور اس کو کسی فریب سے بدل ڈالنا کوئی آسان کام نہیں رہا ہے۔

جماعت اسلامی کی فردِ قراردادِ جرم

(از جناب مولانا الحاج حکیم عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی)

[ذیل میں ایک بزرگ کا مضمون درج کیا جا رہا ہے جو دراصل رسالہ "فاران" کراچی کو بغرضِ اشاعت بھیجا گیا تھا، مگر مدیر فاران نے وہ از راہِ عنایت ہمارے پاس بھیج دیا تاکہ ہم جواب سمیت اسے شائع کر دیں۔ ہم ایک مدت سے سن رہے تھے کہ دیوبند و سہارنپور کے مدارس عربیہ سے انتساب رکھنے والے متعدد بزرگوں کی مجالس میں جماعت اسلامی کے خلاف اعتراضات و الزامات اور وسوسہ اندازیوں کا سلسلہ چل رہا ہے اور ان کے معتقدین بالعموم مسلمانوں کو اس جماعت سے بدگمان کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، لیکن ابھی تک ہمیں تفصیل کے ساتھ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ آخر ہمارا وہ قصور کیا ہے جس کی یہ سزا دی جا رہی ہے۔ اب ہم مدیر فاران کے شکرگزار ہیں کہ ان کے وسیلے سے یہ فردِ قراردادِ جرم ہمیں مل گئی اور پہلی مرتبہ ہمیں اس بات سے آگاہی نصیب ہوئی کہ ان مقدس بارگاہوں میں ہمیں کن قصوروں کا مجرم ٹھیرایا جاتا ہے۔

ابتداءً یہ تحریر صرف "ایک مستند عالمِ دین اور متدین و متشرع بزرگ" کے نام سے آئی تھی۔ بعد میں جب معلوم ہوا کہ یہ ہمارے پاس بغرضِ جواب پہنچ گئی ہے تو اظہارِ نام کی اجازت دے دی گئی۔

اس تحریر میں جو جزوی غلط بیانیاں یا غلط فہمیاں ہیں ان کا جواب حاشیہ میں ہی دے دیا گیا ہے اور آخر میں ایک جامع اصولی جواب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کے قلم سے درج کیا جا رہا ہے۔

اس موقع پر ہم تحدیثاً للنعمۃ جماعت اسلامی کی اس خدمت پر اظہارِ فخر کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایک مدت دراز کے بعد اس امت کو ہماری بدولت ایک نقطۂ اجتماع میسر آیا ہے۔ اس وقت کمیونسٹ، قادیانی، منکرینِ حدیث، خلافت پسند ملاحدہ، فرنگیت زدہ اصحاب و خواتین، اور بریلوی خیال کے حضرات تو قطعاً جماعت اسلامی کے خلاف متحد ہو چکے ہیں۔ اور ان کے ساتھ اہلِ حدیث

اور دیوبندی بزرگوں کا بھی ایک بڑا حصہ اس محاذ پر متفق ہو کر ایک ملت واحدہ بنا رہا ہے۔ جماعت اسلامی کی دعوت نہ اٹھتی تو شاید اتنے مختلف احزاب کسی معاملے میں یوں مجتمع نہ ہو سکتے۔
ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء]

مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے متعلق میرے تاثرات آپ دریافت فرما رہے ہیں۔ دیانۃً جو میری رائے ہے وہ عرض کرتا ہوں۔ گو مجھ کو اندیشہ ہے کہ پوری بات احتیاط کے ساتھ مع اپنے تمام عزوری گوشوں کے اُسی قدر وزن کے ساتھ جتنی کہ ہے شاید ادا نہ کر سکوں۔ ممکن ہے کہیں افراط ہو جائے اور کہیں تفریط۔ اس لئے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہوئے اور ممکن احتیاط برت کر جو کچھ سمجھا عرض کرتا ہوں :-

غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کی دعوت، تحریک اور مجموعۂ لٹریچر کچھ منفعتیں بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور بعض مضرتیں بھی۔ منفعت اس اعتبار سے کہ ایک ایسا طبقہ دین سے آشنا ہو رہا ہے جس کا دین کی طرف میلان دشوار تھا۔ اور وہ الحاد کی دلدل میں مبتلا تھا۔ کم از کم اور مضرتوں کے ساتھ اُن کے متکلمانہ انداز و تعبیر اور حُسنِ ادب و انشا کی یہ خوبی ہے کہ وہ اس طبقے کے ریب و تشکیک یا جحود و انکار کو تصدیق و اثبات کی طرف مائل کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہیں۔ نیز دین کے خلاف اور مذہب سے متصادم آج جو تحریکیں قومیت، وطنیت اور کمیونزم وغیرہ کی راہ سے سامنے آ رہی ہیں اُن کے مقابلے کے لئے پوری طرح مستعد ہے۔ اس خدمت کا وزن اپنی جگہ پر بہت وزنی ہے۔ جو مضرتیں سامنے آ رہی ہیں وہ یہ ہیں۔ جماعت کے حلقے میں غیر شعوری طور پر یہ زعم پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ دین، دین کا درد، اُس کا شعور، بس اس جماعت یا مودودی صاحب کے دائرے میں مخصوص ہے۔ بلکہ حضرات صحابہؓ کے بعد سے دین کو بہ ہمہ معنویات اور بجمیع جہات فقط بس ہم نے سمجھا ہے اور اس کے مقتضیات کو پورا کرنے کی

سعیٔ مشکور صرف ہمارا حصہ ہے[۵۱] جتنی کہ اس سلسلۃ الذہب کی بعض کڑیاں جو حضرت عمر ابن عبدالعزیزؓ سے شروع ہو کر ہندوستان میں خاندان ولی اللّٰہی اور حضرت سید احمد شہیدؒ تک پہنچیں وہ بھی باوجود اپنے تمام محاسن کے اغلاط سے خالی نہ تھیں[۵۲]۔ اس پندار و زعم کا نتیجہ یہ ہے کہ جماعت ایک فرقے کی

---

۵۱ اس مبہم الزام کا اگر کوئی ثبوت موجود ہو تو ضرور ارشاد فرمایا جائے۔ اور اگر یہ نتیجہ صرف اُن تحریروں سے اخذ کیا گیا ہے جو اقامتِ دین کی سعی سے مسلمانوں کی عام غفلت، اور دین کے معاملے میں قوم کے مختلف طبقوں کی کوتاہیوں پر متنبہ کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ تو اس کو بدگمانی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ اور اس بدگمانی سے امت کے اگلوں پچھلوں میں سے کون ایسا شخص بچ سکتا ہے جس نے کبھی اصلاح کی کوشش کی ہے یا اب کرنے اٹھے؟ اگر ارشاد ہو تو زمانہ گزشتہ کے بہت سے بزرگوں کی ایسی تحریروں کے نمونے پیش کیے جائیں جن میں اس "زعم" کا رنگ اس سے بدرجہا زیادہ پایا جاتا ہے جس کی آپ شکایت فرما رہے ہیں۔ بعید نہیں کہ وہ نمونے خود آپ کی نظر سے بھی گزرے ہوں اور آپ کو وہ اس لیے نہ کھٹکے ہوں کہ وہ حضرات آپ کے معاصر نہیں ہیں اور آپ ان سے کوئی "خطرہ" محسوس نہیں فرماتے۔ مگر کیا آپ ان لوگوں کو حق بجانب سمجھتے ہیں جو ان کے معاصر تھے اور جنھوں نے یہی رنگ دیکھ کر ان کے مقابلے میں وہ رویہ اختیار کیا جو آج آپ اور آپ جیسے بہت سے دیندار بزرگ اپنے ایک خادم دین معاصر کے مقابلے میں اختیار فرما رہے ہیں؟ قریب ترین دور کی مثال حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید کی ہے جس پر ابھی ایک صدی سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری ہے۔ ان کے ساتھ ان کے معاصرین کا جو معاملہ رہا ہے اسے ذرا یاد فرمالیں۔

۵۲ ممکن ہے آپ کے نزدیک تمام بزرگانِ سلف معصوم اور منزہ عن الخطا ہوں اور شاید ان کو ایسا سمجھنے کے لیے آپ کے پاس کچھ شرعی دلائل بھی موجود ہوں مگر ہم انبیاء کے سوا کسی کا یہ مرتبہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور خود بزرگانِ سلف نے اپنے بزرگانِ سلف کا یہ مرتبہ ماننے سے انکار کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کی مختلف آرا کے متعلق امام ابوحنیفہ نے فرمایا احد القولین خطاء والماثم فیہ موضوع، اور امام مالک نے صاف کہا خطأ ۔۔۔ فانظر فی ذالک۔ ہم نے جب کبھی سلف صالحین میں سے کسی کی رائے سے اختلاف کیا ہے، یا ان کے کام میں کسی خامی کی نشان دہی کی ہے تو ان کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھ کر، اور ان کے زریں کارناموں کو خراجِ تحسین ادا کر کے کی ہے، اور اس غرض کے لیے کی ہے کہ ہم اپنی حد وسع تک صواب کو پہنچنے اور غلطی سے بچنے کی کوشش کریں۔ اسے اگر آپ بے ادبی یا تعلّی پر محمول فرماتے ہیں تو ہم صرف یہ عرض کرنے پر اکتفا کریں گے کہ ذرا اپنے مدرسوں کی ان تعزیروں کو بھی یاد فرمالیں جو درسِ حدیث و فقہ کے سلسلے میں ہوا کرتی ہیں اور جن میں امام بخاریؒ اور امام شافعیؒ جیسے ائمہ کا اس شان سے تخطئہ کیا جاتا ہے کہ شاید ہماری کسی تقریر و تحریر میں اس کے عشر عشیر کی نظیر بھی نہ پیش کی جاسکے۔

سورت اختیار کر رہی ہے۔ تحزب اور گروہ بندی کی خصوصیت تفریق ہے۔ اور جماعت کے اندر اور باہر کا امتیاز ہے۔ چنانچہ اس جماعت کے افراد کی زبان پر الزام آتا ہے کہ ہم اصلی اور تحقیقی مسلمان ہیں، دوسرے نسلی اور تقلیدی۔ لٹریچر سے جو طبقہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ وہ بقدر تاثر عام علمائے امت سے بدظن ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے کہ دین کی روح سے ہم مطلع ہیں جس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو اجتہاد کا مستحق سمجھنے لگتا ہے۔ چونکہ دنیا کے کسی عالم متقدم یا متاخر پر تو اس کو اعتماد رہتا نہیں۔ اس لئے دین کے بارے میں کسی عالم کی طرف رجوع کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خود اجتہاد کرتا ہے یا جماعت کے وابستہ اہل علم سے رجوع کرتا ہے اور

سے بھی بڑھ کر، علماء امت سے بدظنی تو اب اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ جماعت اسلامی مسلمانوں کی پوری قومی زندگی کی باگ ڈور علمائے دین کے ہاتھوں میں دینے پر تل گئی ہے، اور پنجاب کے تازہ انتخابات میں اسی خطرہ کار جماعت نے (شاید اس ملک کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ) یہ کوشش کی کہ ایک درجن سے زیادہ علماء کا ایک پورا جتھا اسمبلی میں بھیجا جائے، اور پاکستان میں سیاسی اقتدار پر علماء کے قابض ہونے کا خطرہ اگر ہے تو اسی قابل ملامت گروہ کی کوششوں سے ہے، ورنہ اگر یہ گروہ میدان میں نہ ہو، یا نہ رہے تو اس خطرے کے رونما ہونے کا نہ امکان تھا نہ آئندہ اس کا اندیشہ ہے۔ یہ سب علماء سے بدظنی ہونے کے تو کھلے کھلے ثبوت ہیں!

ہمارے متدین اور متشرع ناقد اگر برا نہ مانیں تو ہم عرض کریں کہ جس طریقے سے علماء کے مختلف طبقوں اور بعض نمایاں بزرگوں نے جماعت اسلامی کی مخالفت فرمائی ہے اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کی طرح اس جماعت میں بھی علماء سے بدظنی بلکہ نفرت پیدا ہو جاتی، لیکن اس جماعت کی ذہنی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ کسی ظالم کا ظلم اسے حق اور انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ بعض علماء کی زیادتیوں کے باوجود تمام علماء کے خلاف کوئی جذبہ کسی ادنیٰ درجے میں بھی جماعت کے لوگوں میں پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ خود زیادتی کرنے والوں کے خلاف بھی نفرت کے بجائے اگر کوئی جذبہ پیدا ہوا تو وہ افسوس کا تھا۔ پھر یہ جماعت کبھی علم دین کی اہمیت سے غافل نہیں ہوئی اور اس نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ مسلمانوں کے معاملات کی صحیح طریقے سے سربراہ کاری اگر کچھ لوگ کر سکتے ہیں تو وہی جو دین کا علم رکھتے ہوں۔

جماعت کے پورے حلقے میں ایک عالم بھی ایسا نہیں جس کا علم اور تفقہ تفصیلی مسائل میں لائقِ اعتماد ہو۔ اس لئے اُن کے بڑے بڑے مدعیانِ علم مسائل کے بارے میں فاحش اور مضحکہ خیز غلطیاں کرتے ہیں[۵۱]۔ صرف یہی نہیں کہ فقہ حنفی کے اعتبار سے وہ غلطی کرتے ہوں۔ بلکہ چونکہ کتاب وسنت اور فقہائے امت کے استنباطات پر ان کی نظر بہت کم ہے۔ انھوں نے دین کے صرف ایک ہی شعبہ کا اچھا مطالعہ کیا ہے۔ باقی شعبوں میں اُن کا علم بہت ناقص اور خام ہے اس لئے فاحش غلطیاں پیش آتی ہیں۔ مگر جماعت دین میں انھی کو مرجع سمجھتی اور اعتماد کرتی ہے۔ میرے خیال بلکہ مشاہدہ میں جماعت کی اکثریت میں یہ مرض پیدا ہو رہا ہے۔ جو اشراط ساعت میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اعجاب کل ذی رائ برایہ ہے۔ اس اعجاب رائے کا یہ اثر ہے کہ ہر فرد جماعت قائل باجتہاد اور براہ راست کتاب وسنۃ سے اخذ واستنباط کا مدعی ہے۔ خواہ

۵۱ بڑی مہربانی ہوگی اگر دو چار "فاحش" اور "مضحکہ خیز" غلطیوں کی نشان دہی فرما دی جائے اس کے بعد کچھ عرض کیا جاسکے گا البتہ اصولی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جس نے وسیع پیمانے پر کوئی علمی کام کیا ہو اور اس میں کچھ نہ کچھ غلطیاں نہ کی ہوں۔ مگر یہ آپ لوگوں کی وسعتِ ظرف ہے کہ اپنے گروہ کے کسی شخص سے غلطی ہو جائے تو پہلے تاویلیں کر کر کے اس کی بات بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اور پھر بھی جب بات نہیں بنتی تو اس کو قلم کی لغزش اور سہو ونسیان وغیرہ نرم الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں لیکن اپنے گروہ سے باہر کے کسی شخص کی کوئی غلطی نظر آجائے تو وہ فاحش اور مضحک غلطی سے کم الفاظ کی مستحق نہیں ہوتی، اور معاملہ اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس بنیاد پر فیصلہ یہ صادر کیا جاتا ہے کہ وہ شخص علم سے محروم ہے اور اسے مسائلِ دین میں کلام کرنے کا حق نہیں ہے۔ ہم اس بحث کو ناگوار حد تک بڑھانا نہیں چاہتے، ورنہ اس تعصب اور اجارہ دارانہ ذہنیت کی متعدد مثالیں پیش کرتے۔ تاہم فاضل ناقد سے اور ان کے طرز پر سوچنے والے دوسرے حضرات سے اتنی گزارش ضرور کریں گے کہ جماعت اسلامی کے جن لوگوں کا ذکر آپ نے "بڑے بڑے مدعیانِ علم" کے الفاظ سے کیا ہے، براہِ کرم ذرا اُن کے علمی کام پر ایک نگاہ ڈالیں اور کچھ انصاف کے ساتھ (اگر انصاف کی جنس گرانمایہ آپ کے پاس ہو) بتائیں کہ آپ کے نزدیک ان کے اس پورے ذخیرے میں صحیح کام کتنے ہیں اور "فاحش" و "مضحک" غلطیاں کس قدر۔

اس کا علم اور مبلغِ فکر جماعتی لٹریچر کی چند کتب ہی ہوں۔ اور بے باکی کے ساتھ فقہائے امت اور سلفِ صالحین پر تنقید کے لیے پر تولنے کو تیار[۹۱]۔ مگر نہیں جانتا کہ تنقید و اجتہاد کی حدود کیا ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ حدِ تنقید سے نکل کر تنقیص و تحمیق کی سرحدمیں داخل ہوجاتا ہے[۹۲]۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پیشین گوئی کا مورد بنتا ہے کہ اخیر زمانے میں لوگ ناجائز چیزوں کا نام بدل کر جائز کرلیں گے۔ تنقیص و تخفیف کے ذمیمے کو تنقید کے عنوان سے بدل کر راہ جواز اختیار کرنا عموماً مشاہدہ ہے۔ یہ تنقیص تحتِ وعید۔ لعن آخر هذه الامة اولها (اس امت کے آخر زمانے کے لوگ سلف کی تنقیص کریں گے) کی خبر دے رہی ہے۔

ایک اہم ترین ضرر دین کے ایک بڑے شعبہ سلوک و تصوف اور احسان کے متعلق بھی ہے۔ اکابر جماعت چونکہ اس کوچے سے عملاً اور اعتقاداً بالکل فارغ ہیں۔ اس لیے اب اس جماعت کا مزاج یہ بنتا جارہا ہے کہ اس شعبے کی خیر سے نہ صرف وہ محروم ہیں۔ بلکہ اس خیر کے حاملین صوفیائے کرام اور اربابِ سلوک (جو تنہا اس کفرزار ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آلۂ جارحہ رہے اور جن کے انفاسِ پاک سے آج کروڑوں مسلمان یہاں نظر آرہے ہیں)

۹۱ یہ صریح تہمت ہے جو تقویٰ کا لباس اوڑھ کر لگائی گئی ہے۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ جناب کو کتنے افرادِ جماعت سے ملنے اور ان کے کام اور کلام سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے جس کی بنا پر یہ شہادت ادا کی جارہی ہے کہ جماعت کا ہر فرد کتاب و سنت سے براہِ راست اخذ و استنباط کا مدعی اور فقہائے امت اور سلف صالحین پر تنقید کے لیے پر تولنے کو تیار ہے؟ دوسروں پر جب آپ لوگ زبان کھولتے ہیں تو یوں حق اور انصاف سے بے نیاز ہو کر صریح بہتان گھڑنے تک سے نہیں چوکتے۔ اور دوسرے اگر کبھی پورا پورا ادب و احترام ملحوظ رکھ کر بھی آپ کے گروہ کے کسی چھوٹے یا بڑے سے اختلافِ رائے کا اظہار کر گزریں تو اس کا ایسا گہرا زخم آپ حضرات کے دلوں پر لگتا ہے کہ دس دس بارہ بارہ برس گزر جانے پر بھی جب ٹٹولیے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ہرا ہے۔

۹۲ براہِ خدا ایک مثال ایسی پیش فرمائیں جس میں فقہائے امت اور سلف صالحین کی "تنقیص" اور "تحمیق" کی گئی ہو۔ اور اگر آپ پیش نہیں کرسکتے تو پھر ارشاد ہو کہ یہ حدودِ تنقید سے جناب کی واقفیت ہی کا جلوہ ہے جو ان سطور میں نظر آرہا ہے؟

شعوری یا غیر شعوری طور پر مبغوض ہوتے جا رہے ہیں! اور جن قدسی نفوس کو ہم قرآن و سنۃ کا مکھن کھلانے اور کھلانے والا تصور کرتے تھے آج وہ یوگی، اشراقی، اور سنیاسی کے القاب سے ملقب کیئے جا رہے ہیں۔ اور ان کو قطعاً یہ اندازہ نہیں کہ ہم کتنی بڑی خیر سے محروم اور کسی عظیم جسارت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ صراحتاً وہ لوگ سلوک و احسان کے منکر نہیں۔ مگر حصولِ احسان و تحصیلِ سلوک کے طرق متعارفۂ صوفیا کا وہ اس شدت سے رد کرتے ہیں کہ وہ صرف طرق ہی سے اختلاف کی حد تک نہیں رہتا۔ بلکہ اُن طرق کو اختیار کرنے والوں کی تنقیص اور بدگمانی تک منجر ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے بعض ذی علم محتاط افراد اس تعدی سے محفوظ ہوں جن کی تعداد بہ غایت محدود ہوگی۔ ورنہ عامۃً اکثریت اس سے خالی نہیں ۔۵۱

ظاہر ہے کہ جب مولانا مودودی حضرت مجدد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے تمام کمالاتِ تبحر۔ تدین۔ تفقہ اور تورع اور جامعیت کاملہ کے ساتھ ان کی مجددیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ لکھیں کہ "مگر مسلمانوں کو طرقِ تصوف کی مہلک اور زہریلی غذا ان حضرات نے دی"۔۵۲ تو مولانا نے تو ان حضرات کی معرفتِ شان ملحوظ رکھتے ہوئے اسی جملہ پر اکتفا کیا۔ مقلدین ضروری نہیں کہ تجزیہ کر کے محتاط ہی رہیں۔ وہ کہہ سکتے اور سمجھ سکتے ہیں۔ کہ اگر یہ حضرات مجدد تھے تو مجدد کا پہلا کام ماحول کی تشخیص ہے۔

۵۱۔ ہم پھر دریافت کرتے ہیں کہ جماعت کی اکثریت سے آپ کی واقفیت ہے کتنی جس کی بنا پر آپ دیانۃً کوئی عام حکم چسپاں کرنے میں حق بجانب ہوں؟

۵۲۔ یہ ادھورا اور ایک حد تک خود ساختہ فقرہ جس عبارت سے اخذ کیا گیا ہے وہ رسالہ تجدید و احیاء دین میں صفحہ ۳۷ سے ۵۷ تک ملاحظہ کر لی جائے۔ اس پوری عبارت کو پڑھ کر ہی ایک انصاف پسند ناظر رائے قائم کر سکتا ہے کہ وہاں کیا بات کس رنگ میں کہی گئی ہے اور یہاں اس فرد قرارداد جرم میں اسے کیا رنگ دے کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کسی دنیا پرست یا دین کے منصب سے اختلاف ہی ہو اور یہ نقص ہیں اگر وہ اختلاف باقی رہے مگر کیا کوئی منصف مزاج اور حق پرست آدمی اس کی عبارت پڑھ کر یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ اسی طرح مقصود ہے جس طرح یہاں اسے ... اور اس کی لپیٹ میں پوری جماعت ... کو مطعون کیا گیا ہے؟

اور یہ متعین کرنا کہ جاہلیت کس منفذ اور راستے سے قصرِ اسلام میں داخل ہوئی ہے۔ اس تشخیص اور تعیین کے بعد مجدد کا کام یہ ہے کہ اُس منفذ کو فوراً بند اور اُس راہ کو فوراً مسدود کر دے جس سے جاہلیت نے راہ پائی ہے۔ اور مولانا مودودی کے خیال میں جاہلیت خصوصیت سے براہِ تصوف اس قصر میں داخل ہوئی ہے۔ تو مجدد سرہندی اور شاہ ولی اللہ جیسے مجدد ہیں جنھوں نے اس راہ کو نہ مشخص کیا نہ مسدود کیا۔ صرف صوفیائے جُہّال کی چند مخترعہ رسوم میں اصلاح پر اکتفا کیا حالانکہ ضرورت تھی قطعی انسداد کی۔ تو ظاہر ہے کہ یہ حضرات اور ان کے اختیار کردہ تمام وسائلِ تحصیلِ سلوک۔ جماعت کی نظر میں کس قدر موجب تخفیف ہوں گے۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ سلاسل اربعہ کے تمام مروجہ طرق جن کی اصل کتاب و سنۃ میں بالدلالت موجود ہے۔ اور سلف سے خلف تک متقدمین سے متاخرین تک کسی نے ان کو ترک نہیں کیا حتّٰی کہ اُن میں وہ حضرات بھی ہیں جن کو امت نے من یجدد لھا دینھا کا مصداق اور خدمت تجدید و احیاء کے شرف سے مشرف بھی سمجھا۔ اُن کو اپنایا اور انہی وسائل سے سلوک و احسان کی بلندیوں تک پہنچے حتیٰ کہ امام غزالیؒ تو المنقذ من الضلال ص ۳۱ میں یہاں تک لکھتے ہیں کہ وبالجملۃ فمن لم یرزق منہ شیئا بالذوق فلیس یدرک من حقیقۃ النبوۃ الا الاسم یعنی مختصر یہ کہ جس نے تصوف کا مزہ نہیں چکھا۔ وہ نام کے سوا نبوت کی حقیقت کو جان نہیں سکتا۔ ممکن ہے اس پر یہ کہا جائے کہ تصوف کا انکار نہیں۔ بلکہ طُرقِ تصوف پر گفتگو ہے۔ تو آگے طرق کے متعلق فرماتے ہیں۔ وہ بان لی بالضرورۃ من ممارسۃ طریقتھم حقیقۃ النبوۃ وخاصیتھا یعنی صوفیوں کے طریقے کی مشق سے مجھ کو نبوت کی حقیقت اور خاصیت بدیہی طور پر معلوم ہو گئی۔ یقیناً ان طرق میں کوئی عمیق منفعت اور عظیم مصلحت موجود ہے۔ اور تجربہ اور فکر غائر سے بھی یہ بات معلوم ہوئی کہ اگرچہ یہ طرق وصول احسان کے موقوف علیہ نہیں نہ ان پر انحصار ہے کہ الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق مسلم ہے۔ مگر اس دور بعید عن خیر القرون میں عامۃ افراد و احاد انہی طرق کے ذریعہ اقصیٰ منازل روحانیت۔ قرب و معیتِ حق۔ ربط باللہ خشیۃ اللہ اور استغنائے حق کی خصوصی و معیاری کیفیات راسخہ تک پہنچے ہیں۔ اور مجددین امت

تک نے اِن طُرق کو اختیار و استعمال کیا ہے۔ اور سوائے علامہ ابن تیمیہؒ کے کسی نے ان سے اعتراض نہیں کیا۔ ہو سکتا تھا کہ اسلم ولو کنت کارھا ہی تک رہتے جس پر نجات کا مدار ہے اور جس کی تفسیر حضرت مجدد سرہندیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نفس کے انکار کے باوجود صرف قلب و جنان کی تصدیق پر کفایت فرما کر نجات دیدیں گے۔ البتہ نفس کا تکسر نہ ہو۔ کیف و حال اور ذوق و وجدان کا انشراح عادۃً آج انہی طرق میں منحصر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ بطریق مرادیت اپنے انجذابِ خصوصی سے کسی کو نوازیں۔ اس لئے رد و انکار کے بجائے اگر کسی شخص کو ان طرق سے مناسبت نہ ہو تو نہ اختیار کرے کہ مامور بہ تو یہ نہیں۔ ایسے شخص کے لئے صرف عبادات مقصودہ ماموزہ ہی پر جن کی ہیئات بھی منصوب و منصوص ہیں قناعت کافی ہے۔ اُس کو نسبت احسان انہی عبادات مقصودہ میں حاصل ہو سکتی ہے۔ بلکہ استعمالِ طرق کے بعد جب احسان تک سالک پہنچ جاتا ہے۔ تو مشائخ ترکِ طرق کا حکم دے کر صرف منصوصہ عبادات میں مشغولی کا مشورہ دیتے ہیں۔ غرض مقصد یہ ہے کہ ان طرق کا رد و انکار اور بغض و کراہت تو ایک تعدی ہے جو ان آحاد و اساطین امت کے رد و انکار اور بغض و تخفیف تک مفضی ہوتی ہے۔ غایت ما فی الباب نہ اختیار کرے۔ اختیار پر اصرار نہیں اس لئے کہ ان پر مدار نجات نہ یہ احسان کے موقوف علیہ محض وسائل کے درجے میں ہیں جن کو باحتیاط استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نقشبندیہ اور خصوصاً حضرت مجدد سرہندیؒ نے تصورِ شیخ تک کو استعمال کرایا جو بعید خطرناک اور مخدوش طریقہ ہے محض اس لئے کہ جانتے تھے لوگ عموماً خوگر پیکر محسوس ہیں۔ صورت محسوس کے بغیر مجرد معنیٰ تک وصول کی صلاحیت ہی نہیں محسوس پرستی کا ذوق اس قدر مسلط ہے اور تجرید و تفرید معانی سے اس قدر عاری ہیں کہ بغیر اس کے خدا کا تصور ممکن قلوب میں ہوتا ہی نہیں۔ سالہا سال کی اصنام پرستی۔ صورت پسندی اور اِجْعَلْ لَنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ اور لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً۔ کی بد ذوقی نے تنزیہی الوہیت بے شبہ و مثال بے کیف و لون۔ بے جہت و قیاس خدا کا تصور دشوار تر کر دیا۔ اور وصول تو ضروری لہٰذا ہوائی سفر کے بجائے چھکڑے ہی کے ذریعہ اگر قطع مسافت ممکن ہو تو یوں ہی سہی۔ مقصد تو وصول

ہے۔ مگر چونکہ مخدوش ہے اس لئے بعض حضرات نے اس سے گریز بھی کیا۔ حاصل یہ ہے کہ یہ طرق اس جماعت کے نزدیک اس درجہ منکر اور مبغوض ہو گئے کہ اب یہ بغض و منکریت ذوات صالحین تک پہنچ گئی۔ میرے کان نے، یک رکن جماعت کی زبان سے بلا واسطہ۔ ایک بڑے زبردست صاحب سلسلہ چشتی بزرگ (جن کے وصال پر تین سو سال گزر رہے) کے متعلق ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہتے سنا جو ان کے مزار پر حاضر ہو رہے تھے "کہاں جا رہے ہو۔ ایک سنیاسی ہے جو پتھروں میں پڑا ہے"۔[ل] ایک اور صاحب کو جو ایک بڑے دار العلوم کے فاضل بھی ہیں اور جماعت کے رکن بھی حضرت مجدد سرہندیؒ کے مکتوبات پر رکیک تبصرہ کرتے دیکھا۔[۲] قریب ہی ایک جماعتی ماہنامہ "زندگی" میں ایک شخص کا جو کم از کم ہمدرد تو یقیناً ہے۔ آدمی خاصہ پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ جس میں وہ لکھتا ہے کہ لٹریچر دیکھنے سے مجھ میں یہ انقلاب رونما ہوا۔ کہ اب میں صحابہؓ کے بعد سے آج تک سوائے مولانا مودودی کے کسی شخص کو کامل الایمان نہیں سمجھتا۔ دین کے اس ضروری تقاضے سے جو مولانا مودودی نے سمجھا ہے تعجب ہے کہ صحابہؓ کے بعد سے اب تک ہر شخص فارغ اور خالی الذہن رہا خصوصاً صوفیا نے تو دین کو ایک پرائیویٹ اصول بنا کر جوگ و سنیاس کی حیثیت دیدی۔ میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مسلک کو غلط تصور کرتا ہوں۔ بڑے بڑے مشاہیر امت کا کامل الایمان ہونا میری نظر میں مشتبہ ہو گیا ہے۔ . . . . . آگے چل کر لکھا ہے کہ بعض دفعہ مجھ کو خیال ہوتا ہے کہ میں ہی غلطی پر ہوں۔ ایسا بھی کیا اس تیرہ سو سال میں ایک مودودی صاحب نئے نرالے مولوی۔ مجتہد۔ فہم دین رکھنے والے پیدا ہوئے جنھوں نے سلف کی تمام خدمات پر پانی پھیر دیا۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ پھر کہا ہے۔ باوجود اس کے اصول تحریک کتاب و سنت پر منطبق ہیں اس سے میں دست کش نہیں

[ل] یہ گفتگو کہاں کس شخص سے ہوئی ہے؟ ذرا اس کی صراحت فرمائی جائے تا کہ تحقیق کی جا سکے۔

[۲] ان صاحب کا نام بھی ارشاد ہو اور یہ بھی فرمایا جائے کہ وہ رکیک تبصرہ کیا تھا۔ اس کے بعد ان کا بیان بھی لیا جا سکے گا۔

نہیں ہوں گا۔ الخ[1]

غور فرمائیے کہ یہ سب کچھ کیوں ہے۔ اس لئے کہ مولانا مودودی کا فکری و علمی مزاج و قوام باوجود اپنے اخلاص و نیک نیتی کے اسی انداز کا واقع ہوا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ "میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے براہ راست کتاب و سنت سے سمجھا ہے"۔ یہ عبارت کئی جگہ اُن کی تصانیف میں موجود ہے۔ اس عبارت نے امۃ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام آئمہ، ائمہ فقہا، محدثین اور ان کی تمام علمی۔ فقہی مساعی اور خدمات سے امت کو یکسر مستغنی کر دیا ہے[2]۔ ممکن ہے مولانا کا مقصد اس کے مفہوم میں اس قدر عموم و توسع نہ ہو۔ مگر لٹریچر دیکھنے والے نہ صرف غیر اہل علم بلکہ اہل علم بھی اس عموم کے رجحان سے فارغ نہیں جس کا نتیجہ ہے سلف کی خدمات کی بے وقعتی یا کم از کم استغنا۔ اور خود کتاب و سنت سے اخذ و استنباط کا عزم۔ اور اپنے فہم نصوص و تعیین مدلول کی ترجیح یعنی رجال و ہم رجال کا اعتماد۔ قبل اس جائزہ کے کہ ماخذ کا ذخیرۂ علم کس قدر ہے۔ اور استنباط و اجتہاد کی حدود و شرائط کیا ہیں۔ حالانکہ جمہور اہل حق کا وہ مسلک اور احتیاط ملی

---

[1] یہ عبارت جس کا یہاں اقتباس دیا جا رہا ہے ماہنامہ "زندگی" کے کس پرچے میں شائع ہوئی ہے؟ اگر ماہ و سال کی کچھ تصریح کر دی جاتی تو اصل مضمون نکال کر دیکھا جا سکتا تھا کہ لکھنے والے نے کیا لکھا ہے، ادارہ زندگی نے اسے کس حیثیت سے شائع کیا ہے، اور جناب نے اسے کیا رنگ دے رکھے ہیں۔

[2] یہ پھر ایک صریح تہمت ہے جو اس قدر بیباکی کے ساتھ لگائی گئی ہے جس عبارت کو آپ سیاق و سباق سے الگ کر کے اپنے من مانے معنی پہنا رہے ہیں اس سے قائل کا اپنا منشا یہ ہے کہ وہ دین کے فہم میں ماضی و حال کے کسی شخص یا گروہ کا اندھا مقلد نہیں ہے بلکہ کتاب و سنت کی کسوٹی اپنے پاس رکھتا ہے، اس لئے بڑے بڑے نام لے کر اس کو مرعوب کرنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ جو کچھ منوانا ہو اسے کتاب و سنت کی دلیل سے منوایا جائے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ شخص بزرگان سلف کی تمام علمی و فقہی مساعی سے خود مستغنی بنتا ہے اور دوسروں میں یہ استغنا پیدا کرتا ہے۔ یہ الزام اس پر کیسے لگایا جا سکتا ہے جب کہ اس نے سینکڑوں مواقع پر اپنے مضامین اور کتابوں میں، مفسرین، محدثین اور ائمہ مجتہدین سے استفادہ کیا ہے، ان کے اقوال سے استناد کیا ہے، اور لوگوں کو اُن کی کتابوں سے استفادے کا مشورہ دیا ہے۔

مذاق ہے۔ مجدد اول حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ایک موقعہ پر فرماتے ہیں کہ :۔

خذوا من الرأی ما یوافق من کان	اپنے سے پہلوں کی رائے کو ترجیح دو اور اختیار کرو
قبلکم فانھم کانوا اوفق بالسنۃ	اس لئے کہ وہ تم سے زیادہ اعلم اور موافق سنۃ تھے۔
واعلم منکم۔	یعنی زیادہ رازدانِ مزاجِ دین تھے۔

مولانا مودودی اجتہاد پر زور دیتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی بعض عبارتیں نقل فرماتے ہیں جن میں حضرت شاہ صاحب روحِ اجتہاد کے مردہ ہونے کی شکایت اور تقلید جامد سے اختلاف کر رہے ہیں۔ بلاشبہ شاہ صاحبؒ اس طرف مائل تھے اور فرماتے تھے۔ وجبلتی تابی التقلید وتأنف منه رأسا لکن طلب منی التعبد به بخلاف نفسی۔

مگر تعجب یہ ہے کہ مولانا اُن عبارتوں کو تو نقل فرما دیتے ہیں جو ترکِ تقلید اور اجتہاد کی ترغیب میں وارد ہیں لیکن وہ تصانیف جو دو سالہ قیام حرمین شریفین کے بعد کی اور پختہ حال و عمر کی ہیں، مثلاً فیوض الحرمین۔ حجۃ اللہ۔ تفہیمات۔ عقد الجید۔ اُن میں جس شدت کے ساتھ ترک و منعِ اجتہاد اور مذاہبِ اربعہ میں محدود رہنے کی تاکیدات ہیں۔ اُن سے بالکل صرفِ نظر فرما جاتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ فیوض الحرمین ص ۶۴، ۶۵ میں فرماتے ہیں :۔

استفدت منه صلی اللہ علیه وسلم	میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تین امور کا استفادہ کیا
ثلاثة امور خلاف ما کان عندی	اپنے رجحان کے خلاف ان میں سے دوسری یہ تھی
وثانیھا الوصاة بالتقلید بھذہ المذاھب	کہ ان مذاہب اربعہ (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی)
الاربعة لا اخرج منھا۔	سے ہرگز باہر نہ نکلوں۔

تفہیمات ص ۱۸ میں فرماتے ہیں کہ باوجود شرائط اجتہاد پائے جانے کے اگر کوئی قضیہ ایسا سامنے آئے کہ علمائے سابقین کا کوئی حکم و فتوی اس کے متعلق موجود ہو تو ہرگز اس سے تجاوز نہ کرے۔ عقد الجید ص ۳۸ میں فرماتے ہیں کہ آج مذاہبِ اربعہ سے نکلنا سوادِ اعظم سے نکلنے کے مترادف ہے۔ غرض جا بجا اقوال منع اجتہاد کی عبارات موجود ہیں۔ مگر مولانا نے ان سے قطعی اعتنا نہیں برتا حالانکہ

حالانکہ مقتضائے دیانت یہ تھا کہ دونوں قسم کے اقوال و عبارات نقل فرماتے۔ پھر اپنے رجحان و ترجیح کو پیش کرتے۔ پھر اس جہت میں عموم و اطلاق اس درجہ ہے کہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ مولانا کس نوع اجتہاد کو لانا چاہتے ہیں۔ اجتہادِ مطلق۔ اجتہادِ انتساب۔ اجتہاد فی المذاہب اصحابِ ترجیح میں ہیں کہ اصحابِ تخریج میں۔ البتہ امیر جماعت ہند مولوی ابو اللیث صاحب تو صاف لکھتے ہیں کہ "ہم اجتہادِ مطلق کے قائل ہیں۔ ان اقسام کو نہیں جانتے۔"

اسی طرح فنِ حدیث میں "مسلکِ اعتدال" اُن کا ایک مقالہ ہے جو بعض جہات سے نہایت فاضلانہ ہے اور غیر معتدل بھی ہے۔ محدثینِ کرام کی تحقیقِ حدیث اور تعدیل و تنقیدِ رُواۃ و روایات کے ذیل میں انھوں نے حدیث کے اعتماد کو بہت حد تک کم اور سنت کے وقار کو بہت حد تک گرا دیا ہے۔ اس لئے کہ "بلحاظ اسناد اور بلحاظ تفقہ اُن میں جو مسلّم ہے اُس کی بناء پر کونسی ایسی چیز ہے۔ جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو۔" معیارِ استناد میں بھی احتمالِ نقص اور احوالِ رواۃ بھی غیر معتبر۔ اس لئے کہ "نفس اُن کے ساتھ لگا ہوا تھا اور نفسانی رجحانات سے وہ مبرّا نہ تھے۔" اور یہ رجحانات فعلیت کے درجے میں بھی آتے رہتے تھے۔ تفہیمات مصنفہ مولانا مودودی ص ۹۱ سے دیکھ جائیے۔ خصوصًا فقہاءؒ۔ محدثینؒ۔ اور صحابہؓ کے باہم کلماتِ بدزبانی۔ سب و شتم۔ تضلیل و تحمیق اور تکذیب کے تذکار نے تو آزادیٔ افکار کے اس دورِ ضلال میں ان لوگوں کے دماغوں پر خوب ہی کام کیا جو پہلے سے حق و اہلِ حق کی حرمتوں اور عظمتوں کو اپنے قلب و دماغ کا بارِ گراں سمجھتے تھے۔ حالانکہ مولانا نے متفقہانہ احتیاط کے ساتھ متکلمانہ فکر سے اس جزو پر غور نہ فرمایا کہ جب انھی کے قول کے مطابق اسماء الرجال کے ذخیرے میں کونسی ایسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو تو ان تاریخی روایات ہی پر کیا وثوق ہے جس میں ایسے ایسے جلیل القدر حضرات عام انسانوں کی طرح لڑتے اور ایک دوسرے پر سب و شتم کرتے اور طعن و تشنیع دیتے دکھائے گئے ہیں۔ اور کیا امت پر شفقت

اور اس کے آج کے احوال کی مصالح کو اس میں ملحوظ و مرعی رکھا گیا ہے۔ جبکہ اشراط ساعت لعن آخر ھذہ الامۃ اولھا کی فضا ہموار ہو رہی ہے۔ [1]

حضرت مجدد سرہندیؒ فرماتے ہیں کہ صحابہؓ کے متعلق کوئی ایسا تذکرہ ایسے انداز میں کہ جس میں ذرا بھی ایہام بے وقعتی ہو یا ان کی جلالت شان کے منافی ہو، حضرت اقدس جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے فائدے کو کم کرنے والا ہے۔ خبردار احتیاط کرو۔ حضورؐ کا ارشاد کہ جب میرے اصحاب کا ذکر آئے۔ خاموش ہو جاؤ الصحابۃ کلھم عدول۔ میرے اصحاب دین میں سب ثقہ ہیں۔ قاضی عیاض شفا میں لکھتے ہیں "جاہل راویوں کی ان خبروں سے اعراض کرو جو صحابہ کی شان میں نقص پیدا کرنے والی ہیں۔ محمد رسول اللہ والذین معہ سے ان کی افضلیت ثابت ہے۔"

---

[1] اس جذباتی اپیل کی دل سے قدر کرنے کے باوجود سوال یہ ہے کہ آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ کیا سلف کا وقار قائم کرنے کے لئے آپ یہ دعویٰ کرنا چاہتے ہیں کہ نفس ان کے ساتھ لگا ہوا نہ تھا اور وہ نفسانی رجحانات سے مبرا تھے اور یہ رجحانات کبھی فضیلت کے درجے میں نہیں آئے؟ یا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جرح و تعدیل کا وہ پورا ذخیرہ غلط ہے جس میں یہ شہادتیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے لوگوں نے بڑے بڑے لوگوں کو مجروح کیا ہے؟ یا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسماء الرجال کے ذخیرے میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں غلطی کا احتمال ہو؟ جب معاملہ ایک علمی مسئلے سے متعلق ہو تو اس کا فیصلہ جذباتی اپیلوں سے نہیں کیا جا سکتا۔ علم کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم حقیقت کو بالکل بے لاگ طریقے سے سمجھیں اور مانیں، خواہ وہ ہمارے لطیف حسیات کے لئے کتنی ہی ناگوار اور ہماری مصلحتوں کے لحاظ سے کتنی ہی ضرر رساں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ روایات کے لحاظ سے نقد حدیث کے جس قدر ذرائع ہمارے پاس ہیں وہ مفید علم یقین نہیں ہیں بلکہ ظن غالب ہی تک ہمیں پہنچا سکتے ہیں، اس لئے مجرد سند کی بنا پر کسی خبر واحد کی صحت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے ساتھ درایت سے بھی کام لینا ضروری ہے یہی بات ہے جسے "مسلک اعتدال" میں دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مضمون پر مصنف کو گالیاں تو آج تک بہت دی جا چکی ہیں مگر اس کے دلائل اور مدعا کی غلطی آج تک واضح نہیں کی گئی۔

اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں۔ اگر یہ سوءِ ظن بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ میں داخل ہو۔ اس لئے کہ ہر سوءِ ظن گناہ نہیں، بعض گناہ ہیں جن کے ساتھ قرائن قویہ ظنیہ غالبہ نہ ہوں۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ چونکہ مولانا کو تنقید کا ذوق ہے ایسا کہ بعض دفعہ مناسب حدِ اعتدال اور اپنے مقتدایانہ مجددانہ منصب سے بھی تجاوز اور خروج سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ اور اپنے ہم عصر علماء کے جبہ و دستار کے متعلق اور ان کے عیوب خمسہ کی تفصیل کی خوبی تحقیق سے بھی گریز نہیں فرماتے اور سلفِ صالحین، بڑے بڑے ائمۂ وقت بلکہ صحابہؓ کے متعلق بھی ایسے الفاظ لکھ جاتے ہیں، جو ممکن ہے واقعہ کے تو مطابق ہی کہیں ہوتے ہوں۔ اور اسی تقدیر پر منکر محسوس بھی ہوتے ہیں۔ ورنہ بہتان کہا جاتا۔ مگر کہنے والے کا منصب چونکہ اس سے فروتر ہے۔ اس لئے وہ آں چناں مے روکہ زیبا مے روی سے بالکل مختلف ہو جاتے اور ذوق پر سخت گراں بار بن جاتے ہیں۔ آپ ہی خیال فرمائیے حضرات صحابہؓ کے متعلق یہ کہہ جانا کہ گویا وہ اس طرح حدود اللہ سے صریح تجاوز کر رہے ہیں[1]۔ یا امام غزالیؒ کو فنِ حدیث میں ناقص کہنا اپنے کمال کے

---

[1] اس الزام کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ "حقوق الزوجین" میں ایلاء کے مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے مصنف نے ایک جگہ اس سوال پر بحث کی تھی کہ چار مہینہ کی مدت گزر جانے کے بعد ایلاء کرنے والے کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں اس نے صحابہ کے دو گروہوں کی مختلف آراء نقل کیں اور دونوں میں موازنہ کر کے اس گروہ کی رائے کو ترجیح دی جس نے رجوع کے حق کی نفی کی ہے۔ دوسرے گروہ کی رائے کے متعلق اس نے لکھا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بالفاظِ صریح ایلاء کرنے والوں کو صرف چار مہینے کی مہلت دی ہے، اس لئے یہ مدت گزر جانے کے بعد اس کو رجوع کا حق دینا اس مہلت میں اضافہ کرنا ہے اور یہ "اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے صریح تجاوز ہے"۔ یہ کتاب جب شائع ہوئی تو ایک عالم دین نے مصنف کو توجہ دلائی کہ یہ طرزِ بیان نامناسب ہے، اسے بدل دینا بہتر ہے۔ چنانچہ مصنف نے ان کے مشورے کو بلا تامل قبول کر لیا اور حقوق الزوجین کے دوسرے ایڈیشن میں عبارت کو بدل کر یوں کر دیا کہ "یہ اضافہ بظاہر کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے زائد ہے"۔ (ملاحظہ ہو حقوق الزوجین طبع دوم ص ۲۵) یہ چیز ہے جس پر اتنے بڑے الزام کی بنا رکھی گئی ہے کہ یہ شخص صحابہ کی توہین کرتا ہے اور انہیں حدود اللہ سے تجاوز کا مرتکب ٹھیراتا ہے۔ شاید یہ حضرات اس ایک فقرے کے سوا (جس سے رجوع کئے بھی برسوں گزر چکے ہیں) کوئی دوسری عبارت اپنے اس الزام کے ثبوت میں پیش نہیں کر سکتے۔

دعوے کو مستلزم نہیں تو کیا ہے؟ جو یقیناً ان کا منصب نہیں۔ باہم صحابہؓ یا باہم فقہا اور محدثین کے نزاع و جدال۔ سباب و طعان کو دُہرانا اپنے ذوقِ تنقید کے بیانِ جواز کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ درحقیقت اُن کی مزاجی افتاد اس احترام کی خوگر ہی نہیں جس کے خوگر دوسرے لوگ ہیں۔ عامۃً ان کی جماعت کے لوگ سلف کی عظمت و احترام کی مزعومہ حد قائم کر کے دوسرے احترام پسندوں کو کہا کرتے ہیں کہ "یہ وہ لوگ ہیں جن کے سینوں میں اشخاص کے بُت نصب ہیں"۔ جو جاہلیتِ مشرکانہ کا اثر ہے۔ یہ بات ان لوگوں کے متعلق تو درست ہے جو حق پر رجال کو ترجیح دینے کے عادی ہوں۔ یا جو لَا طَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِی مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ کے منکر ہوں۔ ورنہ جو لوگ سِیَرِ سلف پر نظر رکھتے ہوں۔ جنھوں نے صحابہؓ کے احترامِ نبوت حتیٰ کہ بعض صحابہؓ کا فضلاتِ نبویؐ تک سے معاملۂ حرمت دیکھا ہے۔ پھر تابعین کا صحابہؓ کے مقابلے میں تذلل۔ تلامذہ کا اساتذہ کے مقابلے میں تکسر، منتسبین کا اپنے مشائخ سے تعامل دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ عظمت و حرمتِ اکابر افاضہ اور استفاضہ والوں میں کس قدر ضروری سمجھی گئی ہے اور مدارِ نفع اس پر کس قدر مرتب ہے۔ ہاں حدود ہر چیز کی ہیں جس کی تاکید حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو بھی فرمائی۔ اطرا و مادح والی حدیث اس کی دلیل ہے۔ حضورؐ نے عام اہلِ وجاہت کے لئے بھی ارشاد فرمایا اقیلوا ذوی الھیئات عثراتھم الا الحدود۔ یعنی صاحبِ حیثیت لوگوں کی لغزشوں سے چشم پوشی کرو۔ الّا وہ اغضا جہاں سے حدود اللہ متاثر ہوں۔ جو حق سے متصادم ہوں۔ جہاں نص سے نص کا اضمحلال لازم آئے یا جس جگہ مراتبِ امور کی قدریں متغیر ہونے لگیں البتہ قابلِ نکیر ہوگا۔ اس نوع کے اندازے کے لئے حضرت مجدد سرہندیؒ کا مکتوب نمبر ملاحظہ فرمائیے۔ ایک دفعہ ایک مدراسی عالم[1] جماعت کے مشہور امیرِ حلقہ مظاہر العلوم سہارنپور تشریف لائے۔ طلبائے دورہ کو بخاری لئے ہوئے دیکھا۔ بے ساختہ زمزمہ پیرا ہوئے۔ "کب تک یہ بخاری کے بُت لئے بیٹھے رہوگے۔ میدان میں آؤ"۔ حسنِ ظن سے کام لیا جائے

[1] غالباً یہ اشارہ مولانا صبغۃ اللہ صاحب بختیاری کی طرف ہے۔ جو بات یہاں ان کی طرف منسوب کی گئی ہے اس کی حقیقت وہی بتا سکتے ہیں۔

تو تاویل کی گنجائش ہے۔ کہ علم بہر علم کی روش ترک کرد۔ مگر الفاظ کی درشتنا کی اور عنوان کی بدنمائی اس
افتاد مزاجی کی خبر دیتی ہے جس کا ذکر ہے۔ صوفیائے کرام کے تذکرے میں ایک جگہ مولانا کے الفاظ
ہیں کہ جو لوگ مشاہدۂ غیب کی تمنا رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک نقب زن کی سی ہے جو اللہ کے
حرم میں جھانکنا چاہتا ہو۔ ظاہر ہے کہ علم دو قسم کا ہے۔ ایک علم باللہ، دوسرے علم بالاحکام جیسا کہ
قول حضرت عبداللہ بن عمرؓ ہے۔ یہ علم باللہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ علوم استدلالیہ کو کشفیہ کیا جائے۔ اور
اجمالیہ کو تفصیلیہ۔ جیسا کہ حضرت مجدد سرہندیؒ فرماتے ہیں۔ گویا دوسرے الفاظ میں صور علمیہ کو
حقائق و بصائر اور حال و ذوق تک پہنچایا جائے۔ اور استدلال کی محدود عقلی شہر پناہ سے وجدان
و کشف کی غیر محدود و بے پناہ سرحد تک متصل کیا جائے۔ محسوسات کی سرحد ادراک سے ماورائی
ذروۂ سنام تک اس طرح پہنچائیں جہاں استدلال و تعقل کی حدیں منفعل ہو کر استغنا و اذعان میسر ہو۔
جو چون و چرا، کیف و کم اور تنقید و تفحص سے بلند ہو جس کو حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے
ہیں۔ اگر الفاظ سے ظاہر کیا جائے۔ تو الفاظ و تعبیر کی بے دامانی واضح ہو جائے۔ اور لوگ میری تکفیر
کریں۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں اور اگر ظاہر کروں تو میری شہ رگیں قطع کر دیں قطع البلعوم۔ یہ علم اس علم پر اعتماد
نہیں جو کتاب و سنت سے سمجھا گیا۔ اگر خلاف ہے تو محض ضلال ہے۔ البتہ لکل شئی ظہر و بطن
کے مطابق بطن علم و راسخ علم اور اسرار خفیہ ہیں۔ جو ایک صاحب ذوق اپنے جوہر شناسانہ ذوق
ہی سے سمجھ سکتا ہے اور عارف محقق اپنے عرفان ہی سے اس پر مطلع اور امارات خاصہ ہی سے
اس کو تشخیص کر سکتا ہے۔ ارباب ظواہر اور اصحاب صحو محض اس کو کیا جانیں۔ اس غیب الغیب کے
ذوق و جستجو اور حضور و اضطراب کا طالب امت کا ایک بڑا طبقہ صوفیا، جہال نہیں صوفیائے حق
ہمیشہ رہا جو عقل غیاب نہیں بلکہ عشق حضور و اضطراب والوں کا حصہ ہے جس کے بیان و اظہار پر
شیخ اکبر ابن عربیؒ جیسے مغلوب اور مجدد سرہندی جیسے غالب الحال دونوں قسم کے حضرات مجبور
رہے۔ یہ حرم خداوندی میں نقب زنی نہیں۔ بلکہ احوال و نوائف اور اسرار و مواجید ہیں جس پر نہ
تنقید کی ضرورت نہ رائے زنی کی حاجت۔ ان اسرار پر تبصرہ عوام کے قلوب میں اہل حق و عارفین

کے متعلق سخت بدگمانیوں کا محرک ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے ارشاد کے مطابق یہ عشاق کے صحیفے صرف لپیٹ کر رکھ دینے کی چیزیں ہیں۔ نہ انکار کی گنجائش ہے نہ اس کا تعامل ان کے ساتھ مناسب ہے۔ خلوت کے انفرادی احوال جلوت کی اسٹیج پر افشا و دعوت کے لئے نہیں ہوتے۔ ورنہ لشا (؟) حضرت مجدد سرہندیؒ ایسے حضرات کے ایسے اسرار کا رد و قبول دونوں خطرناک ہیں۔ مگر مولانا کا ذوق یہ ہے کہ وہ ہر میدان میں شہ سواری اور ہر سمندر کی غواصی کرنا چاہتے ہیں۔ اہل ظاہر کا ایسے موضوع پر کلام کرنا ایسا ہی ہے جیسا صوفیا کے جہال کا وحدۃ الوجود پر کلام کر کے وہ معانی بیان کرنا جو ضلال اور شرک قطعی ہیں، ضلوا فاضلوا۔ ایک کنارہ یہ ہے کہ اہل ظاہر اس پر تنقید کریں دوسرا کنارہ یہ ہے کہ جاہل صوفیا، اس کی تعبیر و تصریح کریں۔ نہ وہ محل تنقید نہ یہ مجاز تصریح۔ لپیٹ کر رکھ دو اور سکوت کرو۔ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ان عارفین ہی کو ان اسرار کے افشا کی کیا حاجت تھی۔ کیوں نہ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی طرح اسرار کو اسرار ہی رکھا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت شیخ اکبر ابن عربی قدس سرہٗ نے صاف فرمایا کہ ہماری ان کتابوں کو ہر شخص نہ مطالعہ کرے۔ ان کو کیا خبر تھی کہ آئندہ چل کر پریس کی وسعت ان کی کتب کو عام کر دے گی خود حضرت امام غزالیؒ نے اپنی بعض کتب کو عوام کے نہ دیکھنے کی تاکید فرمائی۔ حضرت مجددؒ کے جو خطوط ہیں وہ اُن کے اہل کو لکھے اور خطاب کئے گئے ہیں۔

اس بیجا دخل در معقول کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مجھے مولانا کی جماعت کے اکابر کے خیالات شیخ اکبرؒ اور مجدد سرہندیؒ کے بارے میں معلوم ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ مجدد سرہندیؒ شیخ اکبرؒ کے متعلق کس قدر احتیاط کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ایک سرا الجاحدون للتصوف کا ہے دوسرا الجہال من الصوفیہ کا۔ ایاکم وایاھم۔

ایک جگہ حضرت مہدی علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے ان احادیث کا انکار کر جاتے ہیں جو علامات مہدیؑ کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ محدثانہ طریق پر ان احادیث کا پایۂ اعتبار کیا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ان احادیث کی علامات کو حافظ ابن حجر مکیؒ اور حضرت مجدد سرہندیؒ

کے ذوق نے معتبر مانا ہے۔ جیسا کہ مکتوبات دفتر دوم ص ۲۸،۶۷ میں اس پر بحث فرمائی ہے۔" اگر ان حضرات کا ذوق مولانا کے نزدیک کسی درجے میں وقیع ہے اور امام غزالی کی طرح وہ بھی اس میں ناقص نہیں ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ مولانا مودودی باوجود اپنے اخلاص و نیک نیتی اور سچے جذبۂ خدمت دین رکھنے کے نیز سیاسی نظر و فکر اور موضوع ارتفاقات پر اچھی گہری نظر و بصیرت رکھنے کے موصوف افکارات میں اپنے اس فکری مزاج و قوام کے اعتبار سے امت مسلمہ کے لئے مفید نہیں۔ ہاں اپنی خصوصی متکلمانہ تعبیر و قابلیت کی جہت میں ملاحدہ و زنادقہ کے لئے ان کے لٹریچر کی افادیت کا انکار بے انصافی ہے۔ اگر مولانا صرف ایک سیاسی لیڈر ہوتے تو مضائقہ نہ تھا۔ ان کا ارتقائی تذکرہ مہدی سوڈانی، عبدالکریم مراکشی، جمال الدین افغانی سے زیادہ واضح اور مدلل ہے۔ مگر ان کی حیثیت مقتدایانہ، محدثانہ، فقیہانہ، مفسرانہ بھی ہے۔ اور معتقدین نے اب مجددانہ حیثیت بھی تسلیم کر لی ہے۔ جماعت اسلامی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مدیر کوثر لاہور نے ان کو اس صدی کا مجدد بنایا ہے (کوثر ۸۔ اگست ۱۹۴۶ء) آخری مجدد حضرت سید احمد شہید بریلوی قدس سرہٗ کی شہادت ہزارہ کے پورے سو سال بعد ان کے ظہور اور دعوت تجدید و احیا سے ان کے مجدد مأۃ ہونے کا یقین دلایا ہے[۱]۔ اب بات اہم ہو گئی۔ نبی کی دعوت پر لبیک کہنے والا مسلمان اور منکر کافر ہوتا ہے۔ مجدد کی

---

[۱] عجیب لطیفہ ہے کہ ۸۔ اگست ۴۶ء سے کوثر کی کوئی تاریخ اشاعت ہے ہی نہیں۔ ۹۔ اگست البتہ اس کی تاریخ اشاعت ہے، مگر ۴۸ء میں عید الفطر کی وجہ سے اس تاریخ کا پرچہ شائع نہیں ہوا تھا۔ تاہم احتیاطاً ہم نے اگست ۴۸ء، ۴۹ء اور ۵۰ء کی تمام اشاعتوں کو لفظ بہ لفظ پڑھ کر دیکھ لیا، مگر کہیں اس مضمون کا نام و نشان تک نہ پایا۔ پھر مدیر کوثر، جناب ملک نصر اللہ خاں صاحب عزیز سے دریافت کیا کہ ماہ و سال سے قطع نظر کیا کبھی ان کے قلم سے وہ "کلمات کفر" نکلے ہیں جن کا حوالہ ان متشرع و متدین بزرگ نے دیا ہے؟ مگر انھوں نے سن کر کانوں پر ہاتھ رکھے اور صاف انکار کیا۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس فرد قرار داد جرم میں یہ صریح الزام کس بنیاد پر درج ہوا ہے۔

دعوت پر لبیک کہنے والا متقی اور گریز کرنے والا فاسق ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ پر مسلم ہے۔ اب ناممکن ہے کہ ان کے تفردات افکار، سیرت اور کردار آپ سے آپ پیرووں میں سرایت نہ کریں۔ جیسا کہ خود مولانا نے اپنی ایک تحریر مطبوعہ جریدہ محمود میں لکھا ہے جبکہ ایک شخص نے مشرقی کی تحریکِ خاکساریت میں داخلے کی اجازت چاہی اس شرط پر کہ مشرقی کے عقائد و افکار سے کوئی علاقہ نہ رکھے گا۔ تو مولانا نے جواب میں کہا تھا کہ ایسی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو عقل کے افلاس میں مبتلا ہو۔ آپ کسی تحریک میں داخل ہوں اور لیڈر کے خیالات، سیرت اور کردار سے متاثر نہ ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔ لیڈر کے خیالات۔ افکار۔ کردار۔ سیرت تحریک کی جان ہوتے ہیں۔ الخ وغیرہ وغیرہ۔ اور مولانا کا اندازِ فکر و تحقیق یہ ہے جو مذکور ہوا۔ جو شخص سلف صالحین اور جمہور امۃ اور اہلِ حق کے مذاق سے کچھ بھی آشنا ہو گا وہ مولانا کے فکر و مذاق کو اُس سے بہت مختلف پائے گا۔ اُن کے لٹریچر کی خاصیت۔ سلف کی غیر شعوری تخفیف و تردید۔ اور اپنی شعوری تصویب و توثیق اور اعجاب رائے کے سوا کچھ نہیں جو نتیجۃً سوادِ اعظم سے نکلنے کے مترادف ہے۔ حیرت ہے کہ کل تک ماضی قریب ہی میں جو لوگ جیسے حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اکابر دیوبند جو ۱۸۵۷ء کے بعد اپنے تقوے۔ تورع۔ تفقہ خدمتِ دین۔ اماتِ بدعت اور احیاء سنۃ کے اعتبار سے روشنی کے منارے سمجھے جاتے تھے۔ آج وہ غیر متبع سنۃ قرار دئیے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کے امیر جماعت کی یہ تحریر میں نے خود دیکھی ہے[1]۔ کل تک جو لوگ جیسے خواجہ معین الدین اجمیری اور

[1] امیر جماعت اسلامی پاکستان کی تو کوئی ایسی تحریر پیش نہیں کی جا سکتی جس میں مذکورہ بالا بزرگوں کو "غیر متبع سنت" کہا گیا ہو، یا ان کی شان کے خلاف ہی کوئی بات کہی گئی ہو۔ رہے امیر جماعت اسلامی ہند، تو ان کی بھی کوئی ایسی تحریر ہماری نظر سے نہیں گزری۔ بہر حال چونکہ یہ الزام اُن پر لگایا گیا ہے اس لئے اس کا جواب انھی کے ذمے ہے۔

خواجہ بختیار کاکیؒ جو تنہا ہندوستان میں شمعِ اسلام روشن کرنے والے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کرکے اس کفرزار میں تنویراتِ اسلام پھیلانے والے اور اپنی گرمیٔ رخسار سے محفلِ کفر و ظلمت کو پھونک دینے والے تھے۔ آج وہ جوگی اور سنیاسی تصور کئے جا رہے ہیں[1]۔ حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جن کے متعلق کہا جاتا کہ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ۔ یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ پس ہدایت میں انہی کا اقتدا کیجئے۔

یہ قاعدہ ہے کہ ایک نبی کے بعد دوسرا نبی پہلے کی تائید کرتا ہوا تصویب و توثیق اور تحسین کرتا ہوا آتا ہے۔ اسی طرح جانشینِ انبیاء مجددین ہیں جو قبل مجددین کی تائید، تکریم اور تصویب کرتے ہوئے آتے ہیں۔ مگر فلاسفہ اس سے مختلف ہیں۔ ایک آنے والا فلسفی، فلاسفۂ ماقبل کی تردید، تنقیص اور تخفیف کرتا ہوا آئے گا۔ سابق فلسفی کی تحمیق اور اس کے نظریات کی تردید اس کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے شبہ ہوتا ہے کہ مولانا ایک فلسفی ہیں اور فلسفیانہ ذوق کا یہ لازمہ ہے۔ رہے معتقدین جنہوں نے ان کو مجددیت کا مقام دیدیا ہے[2]۔ تو اگرچہ یہ ایک خفی چیز ہے۔ اماراتِ واضحہ ہی سے کچھ قیاس ہو سکتا ہے۔ بظاہر تو یہ اطراء معلوم ہوتا ہے جس میں لوگ ہمیشہ مبتلا رہے ہیں۔ عیسائیوں نے فرطِ عقیدت سے بندۂ خدا کو خدا بنا دیا۔ شیعوں نے فرطِ محبت ائمہ اماموں کو ولایت سے گزار کر مقامِ نبوت تک پہنچا دیا۔ عامۃً معتقدوں نے اپنے مشائخ کو ارباباً من دون اللہ بنا دیا۔ ذرا کسی شخص میں غیر معمولی چیز اپنی فکر و پرواز سے زیادہ محسوس کی اور اس کو حسبِ فکر اقصیٰ مقام دے دیا۔

۱؎ کیا اس الزام کے ثبوت میں کوئی ایک فقرہ یا ایک لفظ ہی پیش کیا جا سکتا ہے؟

۲؎ یہ الزام پوری ہوشیاری کے ساتھ بار بار دہرایا جا رہا ہے، کیونکہ اس کے بغیر عوام کے جذبات بھڑکائے نہیں جا سکتے۔ مگر آج تک کسی نے ایسی کوئی شہادت پیش نہیں کی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ شخص مذکور نے خود مجدد ہونے کا دعویٰ کیا ہو، یا جماعت اسلامی کے لوگوں نے اسے مجدد قرار دیا ہو۔ رہی یہ بات کہ کوئی یہ "خیال" رکھتا ہے، یا کسی نے ایسا "تصور" کر لیا ہے، یا کسی کو "یہ مقام دیدیا گیا ہے"، تو اس طرح کی باتیں جو لوگ دوسروں کے متعلق کہتے اور لکھتے ہیں، وہ شاید خود اپنے آپ کو عالم الغیب اور علیم بذات الصدور سمجھتے ہیں۔

کسی کو شعر کا پیغمبرِ اعظم بنایا، کسی کو سیاست کا اوتار کہا، کسی ادیب کو مجموعۂ ادب کا خالق کہہ گزرے۔ علامہ۔ فہامہ۔ امام الائمہ القاب تو روزمرہ کی تقسیم ہے۔[1] غرض چونکہ اصل مالک الملک۔ علام و قہار فاعلِ مختار کی سطوت و جبروت عظمت و کبریائی سے ذوق آشنا نہیں۔ ساری صفاتِ علیا مخلوق میں تقسیم کرنے

---

[1] برا نہ مانیں تو ایک سوال ہم بھی پوچھ لیں۔ ابھی ابھی ایک محترم شخصیت کو "جامع المجددین" کا جو لقب دیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ دوسروں کے تو قول و فعل نہیں بلکہ خیال پر یہ لتاڑ، اور خیال بھی وہ نہیں جس کا آپ کو علم ہو بلکہ وہ جو آپ نے بدگمانی کی بنا پر ان کی طرف منسوب کر دیا ہو، لیکن آپ کے گروہ میں علی الاعلان ایک بزرگ کو جامع المجددین کہا گیا اور ان کے کارناموں کا مجموعہ اسی نام سے شائع کیا گیا، اس پر بھی کسی نے کوئی قباحت محسوس نہ فرمائی۔ سوال یہ ہے کہ کیا کچھ مخصوص حقوق آپ لوگوں نے رجسٹرڈ کرا رکھے ہیں؟ فاضل ناقد جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے ہاں کی شخصیتوں کو بڑے بڑے القاب و خطابات کے ساتھ مشتہر کرنے، اور انتہائی مبالغہ آمیز طریقے سے ان کی مدح و ثنا کرنے میں ممتاز ہے۔ آپ اس گروہ کی مطبوعات اٹھا کر دیکھیے۔ ان میں آپ کو جگہ جگہ یہ القاب ملیں گے۔ قطب وقت، راس الفقہاء، قدوۃ الفقہاء والمحدثین، شیخ المشائخ، شیخ الکل، شمس العارفین، زبدۃ الفضلاء والمتکلمین، راس اہل البر والتقی، رئیس اصحاب المجد والنہی، تاج الملت، سراج الامت، شمس سماء التحقیق، مخزن العلوم، مرجع الکمالات۔ وغیرہ۔ دوسری طرف جماعت اسلامی کی تمام مطبوعات، رسائل اور اخبارات اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ یہاں ان شاء اللہ کوئی چیز آپ ایسی نہ پائیں گے جس سے یہ محسوس ہو کہ یہ لوگ اپنے گروہ کی بعض خاص شخصیتوں کا نام اچھالنے اور ان کی عظمت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس صریح طور پر آپ یہ دیکھیں گے کہ اس جماعت نے شخصیت پرستی کے ایک ایک منفذ کو بند کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے رہنماؤں کے ساتھ اس کا معاملہ پاکستان و ہندوستان کی تمام سیاسی و مذہبی جماعتوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس پر یہ حال ہے کہ اگر کبھی احیاناً جماعت اسلامی کا کوئی شخص اپنے کسی رہنما کے لیے کوئی کلمۂ مدح و تحسین لکھ بیٹھتا ہے یا زبان سے نکال دیتا ہے تو وہ ہمارے متشرع و متدین بزرگوں کے لیے اس قدر ناقابلِ برداشت ثابت ہوتا ہے کہ برسوں وہ اس کے رنج میں تڑپتے رہتے ہیں، اس کے تراشے کاٹ کاٹ کر رکھتے ہیں اور ایک ایک شخص کو دکھاتے پھرتے ہیں، اور جب موقع ملتا ہے اس شان سے دل کا بخار نکالتے ہیں جس کا ایک ادنیٰ سا نمونہ اس تحریر میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ محض تنگ ظرفی ہے یا اس کے ساتھ کچھ اجارہ داری کا جذبہ بھی شامل ہے؟

کے لئے بے چین ہیں۔ غور کیجیے تو اس اطراء و مدح میں جذبۂ شرک کی پنہانی کارفرما ہے اور نیز اپنا احساسِ کمتری کسی برتر محسوس کے سایۂ عطوفت کا جویاں ہے۔

شاید میں ذرا تجاوز کر گیا۔ استغفر اللہ۔ اَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَةَ رَبِّكَ۔ ہم معترض ہونے والے کون۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ہمیں بھی اہلِ حق کی تائید و نصرت سے محروم نہ فرمائیں۔ اور مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ ہونے کے مظلمہ سے بچائے۔ یا ہماری قلتِ نظر و نقصِ فہم کو اعتذار میں قبول فرمائے[1]۔ بادر دکشاں ہر کہ در افتاد بر افتاد، ما تجربہ کردیم دریں دیرِ مکافات۔ کے خوف سے واللہ فارغ نہیں ہوں۔ ورنہ تو امت کو اُن کی اجتہادی اغلاط کے ضرر سے بچائے۔

میں نے سُنا جب وہ جیل سے رہا ہو رہے تھے۔ تو اُن کو مع رفقا کے اُن کے علم و اطلاع میں لاکر فوٹو بھی لیا گیا۔ اگر یہ صحیح ہے تو تعجب ہے۔ اس لئے کہ مجھ کو یہ معلوم ہے کہ فوٹو کی حُرمت پر اُن کی رائے اہلِ حق سے مختلف نہیں۔ پھر ایسا کس طرح ہوا۔ کیا ان کی طرف سے اس پر نکیر نہیں ہوا[2]؟

اس سب کے باوجود نفسِ تحریک۔ اقامتِ دین و دستورِ اسلامی کی سعی یقیناً مشکور ہے اس کی مخالفت منشائے حق کی مخالفت ہے جس طرح ممکن ہو۔ تائید و نصرت سے گریز نہ کیا جائے[3]۔

معافی چاہتا ہوں۔ تحریر طویل ہو گئی۔ اور استغفار کرتا ہوں۔ اگر حد سے نکل گیا ہوں اللہ تعالیٰ

---

[1] جزاک اللہ اس تقویٰ کے قربان جائیے۔ سب کچھ فرما چکنے کے بعد اب حضرت کو "شاید ذرا تجاوز کر جانے" کا احساس ہوا، اور اس احساس نے بھی جناب کو پچھلے ارشادات کی طرف رجوع کر دیکھنے کے بجائے اگر کسی بات پر ابھارا تو وہ یہ کہ استغفر اللہ کہنے کے بعد چلتے چلتے ایک چوٹ اور کر جائیں۔

[2] شاید حضرت کو اس موقع پر اپنے گروہ کے اکابر کی وہ تصویریں یاد نہیں رہیں جو بارہا اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔

[3] اس سے بڑھ کر تائید و نصرت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ نے یہ مضمون لکھا اور آپ کے گروہِ مقدس کے بہت سے بزرگ ماشاءاللہ انتہائی شانِ تقویٰ کے ساتھ اکثر خفیہ و علانیہ اسی طرح کی تائید و نصرت فرماتے رہتے ہیں۔ جزاکم اللہ عنا جزاءً وفاقا۔

میری۔ آپ کی۔ مولانا اور اُن کے رفقاء کی مغفرت فرمائے اور اغلاط پر متنبہ فرما کر صراطِ سوی پر چلائے۔ آمین۔ فقط والسلام۔

تتمہ

اوپر کا مضمون موصول ہونے کے بعد ایک مدت گزر چکی تھی کہ صاحبِ مضمون کی طرف سے اس کا یہ تتمہ بھی موصول ہوا جس کو انھوں نے خود "روحِ مضمون" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے اپنا نام بھی ظاہر فرمایا اور پورا مضمون اپنے نام سے شائع کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس کے ساتھ ان کی ہدایت ہے کہ اس تتمہ کو ان کے مضمون کے اس حصے کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے جہاں انھوں نے مودودی کو ایک فلسفی ثابت کیا ہے اور ایک داعیِ حق سے اس کی حیثیت مختلف قرار دی ہے۔ یہ تتمہ حسبِ ذیل ہے:۔

ایک خصوصی بات جو گاہ بگاہ موجبِ خلجان ہوتی ہے، یہ بھی ہے جو شاید بعض تفنّن پسند معقولی دوستوں کے لئے میرے وہمی یا کم فہم ہونے کی دلیل ہو۔ مگر بندا کرے کہ وہ اللہ میرے لئے بیان پرش قلبی خشیتہ شعر حدیث میں آیا ہے: اِنَّ اللّٰہَ اِذَا اَحَبَّ عَبْداً دَعَا جِبْرِیْلَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَاناً فَاَحِبَّہٗ فَقَالَ فَیُحِبُّہٗ جِبْرِیْلُ۔ ثُمَّ یُنَادِیْ فِی السَّمَاءِ فَیَقُوْلُ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ فُلَاناً فَاَحِبُّوْہُ فَیُحِبُّہٗ اَھْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ یُوْضَعُ لَہُ الْقَبُوْلُ فِی الْاَرْضِ۔

اس حدیث کا منشا رجال کے حق و قبولیت کا معیار بتلانا ہے۔ مقبولِ عند اللہ کی مقبولیت خواص سے شروع ہو کر عوام تک پہنچتی ہے۔ برعکس مولانا مودودی کو بھی غالباً یہ کھٹک محسوس ہوئی۔ چنانچہ ایک جگہ اشارات میں انھوں نے لکھا ہے[1] "تعجب ہے کہ ہماری دعوت و تحریک پر لبیک کہنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو ہندوستان کے قبرستانوں سے موت کی سند لے کر نکلے ہیں یعنی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فضلا اور گریجویٹ"۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ رہے وہ لوگ جو کم از کم ہماری علم و اطلاع میں اپنے علم و عمل، فکر و اخلاص، تجرد و تدین، رائے اور یمین کے اعتبار سے عظیم القدر ہیں اور جن کی

[1] یہ جناب کا حسنِ ظن ہے کہ وہ اشارات اس احساس کی بنا پر لکھے گئے تھے۔ توجیہ القول بما لا یرضیٰ قائلہ کی یہ ایک دلچسپ مثال ہے۔

تاریخ نشاۃ فی عباداتِ الٰہ و شتیبا کی مصداق ہے وہ اب تک بالکل یکسو اور غیر متوجہ ہیں۔ حالانکہ اُن میں وہ لوگ بھی ہیں جن کی زندگیاں لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا کی پیہم جدوجہد کی شاہد بھی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُن کے طریقِ کار سے کسی کو اختلاف ہو۔

اس سے یہ خیال نہ فرمائیں کہ میں حق کو رجال سے پہچاننے کے حق میں ہوں۔ اصل یہی ہے کہ حق سے رجال کو پہچانا جاتا ہے۔ بشرطیکہ حق شناسی موجود ہو۔ مگر اس جگہ مضمونِ حدیث اولی خواص میں مقبول ہونا پیشِ نظر ہے جو یہاں مفقود ہے۔ کل تک جو لوگ یا رائے سے کورے تھے۔ یا یمین میں کور علم و فکر سے عاری تھے یا تقویٰ و تورع سے فارغ۔ ختمِ نبوت میں مذبذب تھے۔ یا خکساریت کے علمبردار۔ نیچریت سے مسموم تھے یا الحاد کے شکار۔ وہی متوجہ ہو رہے ہیں۔ اہلِ علم و تقویٰ گویا روشناس ہی نہیں۔ یا مدارس عربیہ کے چند نئے نئے فارغ شدہ جو زمانۂ تحصیل میں بھی بخاری بدوش اور کمیونزم بر کف تھے۔

یا پھر یہ فیصلہ کیجئے کہ یہی لوگ سوسائٹی کا مکھن تھے جو ندائے حرم پر لبیک پڑے اور جن کو ہم نے خواص سمجھا وہ ہماری علم و اطلاع اور معرفت کا قصور تھا جس پر نظرِ ثانی ضروری ہے۔ نیز اپنے معیارِ حقانیت کا جائزہ بھی ضروری ہوگا۔ ایسا تو نہیں کہ خرد کا نام ہم نے جنوں رکھ دیا ہو اور جنوں کا خرد۔ اور کشفِ غبارِ حجاب پر تحت رحل کچھ اور ہی خلافِ توقع سامنے آئے جس کے لئے ہم بالکل تیار نہ ہوں۔ بہرحال یہ جو کچھ عرض کیا بدرجہ تخطور ہے نہ دلیل۔ اور دل چاہے تو فتنہ سمجھ لیجئے مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔

جواب

از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

اس تحریر میں جماعت اسلامی پر جو الزامات عائد کئے گئے ہیں ان پر گفتگو کرنے سے پہلے میں صاحبِ تحریر بزرگ اور ان کے انداز پر سوچنے والوں کے اس عجیب و غریب طرزِ فکر پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں جس میں یہ حضرات مبتلا ہیں۔

ایک طرف تو یہ حضرات ایک شخص کی نسبت یہ رائے رکھتے ہیں کہ اس کی تحریریں سلف کی "تنقیص وتحمیق" اور اپنی تصویب وتوثیق اور اعجاب رائے کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں۔ اور دوسری طرف یہی فرماتے ہیں کہ اس کی دعوت اور اس کے لٹریچر سے "ایک ایسا طبقہ دین سے آشنا ہو رہا ہے جس کا دین کی طرف میلان دشوار تھا"۔ ایک طرف تو ایک شخص کی تحریروں کا نتیجہ ان حضرات کے خیال میں یہ نکل رہا ہے کہ "لوگ سوادِ اعظم سے کٹتے جا رہے ہیں"۔ دوسری طرف اُسی شخص کی تحریروں کی یہ برکت بھی بیان کی جا رہی ہے کہ "وہ اُس طبقے کے ریب وتشکیک یا جحود وانکار کو تصدیق واثبات کی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہے جو الحاد کی دلدل میں پھنسا ہوا تھا"۔ ایک طرف تو ایک پوری جماعت کی جماعت کے علم وفضل پر ان کا یہ تبصرہ ہے کہ "ان میں ایک عالم بھی ایسا نہیں ہے جس کا علم وتفقہ تفصیلی مسائل میں لائق اعتماد ہو"۔ دوسری طرف اُسی جماعت کی نسبت یہ ارشاد بھی ہے کہ "دین کے خلاف اور مذہب سے متصادم جو تحریکیں آج چل رہی ہیں اور قومیت وطنیت اور کمیونزم وغیرہ کی راہ سے سامنے آ رہی ہیں ان کے مقابلے کے لئے وہ پوری طرح مستعد ہے"۔ اور ان سب سے عجیب تر بات یہ ہے کہ ایک شخص کو یہ حضرات ایک مفسر، ایک محدث، اور ایک فقیہ کی حیثیت سے تو ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، لیکن اگر وہی شخص ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ان کے سامنے آئے تو اس کو اپنا امام بنا لینے کے لئے بالکل تیار ہیں۔

فکر ونظر کا یہ انتشار ایک طرف تو ان حضرات کی ایک بہت بڑی نفسیاتی کمزوری کا پتہ دے رہا ہے۔ دوسری طرف اس سے اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ اسلام کے متعلق اُن کا تصور اُس تصور سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے جو عیسائی اپنے مذہب کے متعلق رکھتے ہیں۔

اُن کی نفسیاتی کمزوری تو یہ ہے کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے ان لوگوں کو جو خلش ہے وہ اس بات کی وجہ سے ہرگز نہیں ہے کہ خدانخواستہ ان کے ہاتھوں اسلام کو کوئی نقصان پہنچ رہا ہے۔ بلکہ ساری خلش اس بات کی وجہ سے ہے کہ مولانا مودودی کی تحریروں اور جماعت کی دعوت سے خود ان کے حلقہائے عقیدت بھی متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اگر ان حضرات کو

اس بات کی طرف سے اطمینان ہو جائے کہ ان کے اپنے حلقے جماعت کی اثر اندازیوں سے محفوظ رہیں گے تو پھر مولانا اور ان کے رفقا جو چاہیں کرتے پھریں، انشاء اللہ سب خیر و برکت اور خدمت و اعانتِ دین ہے۔ ورنہ آخر اس کے کیا معنی کہ جو شخص ان کے خیال کے مطابق مسلمانوں میں ایک نئے فرقے کی بنا ڈال رہا ہے، جو کتاب، سنت اور سلف کے استنباطات پر نظر نہ رکھنے کے باوجود خود بھی اجتہاد کا زعم رکھتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے دماغ میں بھی اجتہاد کی ہوائے خودسری بھر رہا ہے، جس نے تصوف و احسان سے اور اس کے اساطین، و عمائد کے خلاف لوگوں کے اندر نفرت و تحقیر کے جذبات پیدا کئے ہیں، جس نے حدیث کے وقار کو بہت حد تک کم اور سلف کے وقار کو بہت حد تک گرا دیا ہے" جو اپنے ہم عصر علماء کے جبہ و دستار کے مسخرے اور ان کے حواسِ خمسہ کی تعطیل و تحمیق سے بھی گریز نہیں کرتا" جو بسا اوقات بڑے سے بڑے ائمہ وقت بلکہ صحابہ کے متعلق بھی ایسے الفاظ کہہ جاتا ہے جو بعض حالات میں "بہتان" قرار دیئے جا سکتے ہیں ـــــ اسی کو اور اس کے ساتھیوں کو اس بات کی چھوٹ دی جا رہی ہے کہ وہ نئے تعلیم یافتہ لوگوں کی درسگاہوں اور جدید تحریکات کے علمبرداروں اور ان کے پیروؤں کے اندر جو چاہیں پوری آزادی کے ساتھ پھیلاتے پھریں۔ کیا یہ مسلمان سوادِ اعظم کے اجزا نہیں ہیں، اور ان کو سوادِ اعظم کے جسم سے کاٹ کر الگ کر دینے میں کوئی گناہ نہیں ہے؟ کیا اس گروہ کے اندر اجتہاد کی ہوائے خودسری اگر بھر گئی تو "اعجاب کل ذی رائے برأیہ" کا فتنہ اس امت میں نہیں برپا ہو جائے گا؟ کیا یہ بیچارے تصوف و احسان کی برکتوں اور اکابر امت کے ساتھ عقیدتمندیوں کے محتاج نہیں ہیں کہ ان کو ایسے بے دینوں کے حوالے کیا جا رہا ہے جو ان کو نہ صرف علمائے امت ہی سے بلکہ صحابہؓ تک سے بدگمان کیے رکھ دیں گے؟ کیا یہ گروہ "اقترابات" کی ضرورت سے بالکل مستغنی ہے کہ اس کو صرف "ارتقاقات" ہی پڑھایا جا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ بھی اگر اسلام کے محتاج ہیں تو اسی اسلام کے محتاج ہیں جو اصلی اور صحیح اسلام ہے۔ ورنہ ایک مرتبہ اگر یہ غلط اسلام کے راستے پر ڈال دیئے گئے اور ان کو کسی غلط قسم کے آدمی یا غلط قسم کی جماعت کے تحت

منظم ہو جانے کا موقع دے دیا گیا تو یہ بھی اسی طرح اس امت کے لئے فتنہ بن سکتے ہیں جس طرح کوئی اور گمراہ فرقہ بن سکتا ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے یہ بزرگ علما ایک طرف تو مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے اندر اتنے بے شمار خطرے گن رہے ہیں لیکن دوسری طرف اس امت کا سارا ذہین طبقہ انھی کو ان کے دے رہے ہیں کہ ان کو وہ جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ ایک طرف احتیاط بلکہ تنگ نظری کا یہ عالم ہے کہ ہماری چھوت تک سے مسلمان پلید ہو جاتا ہے اور دوسری طرف یہ فیاضی ہے کہ سارا ذہین طبقہ ہماری چراگاہ بنا کے چھوڑ دیا گیا۔

غور کیجئے کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات کبھی مسلمانوں کے معاملات پر اسلام کے نفع و نقصان کے پہلو سے غور کرنے کے عادی نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ اپنے گروہ اور اپنے دھڑے کے نفع و نقصان کو سامنے رکھ کے غور کرتے ہیں۔ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی دعوت سے ان کے عقیدت کیشوں کی عقیدت مندیاں متزلزل ہو رہی ہیں اور ان کے دھڑے کے آدمی ٹوٹ رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس دعوت کے اندر ان کو بہت سے کیڑے نظر آتے ہیں اور یہ ان کو کرید کرید کے اپنے عقیدت مندوں کے سامنے رکھتے ہیں کہ کہیں بے خبری میں ان میں سے کوئی اس غذا کو نہ چکھ لے۔ باقی رہے دوسرے مسلمان جن کی نسبت ان حضرات کو یقین ہے کہ اب وہ نئی تعلیم کی بدولت ذہنی اعتبار سے اس قدر متغیر ہو چکے ہیں کہ ان کی طرف کبھی رخ بھی نہیں کرنے کے، اُن کے خیر و شر سے اِن کو کوئی بحث نہیں ہے۔ اُن کو جس کا جی چاہے جس راہ پر لگا دے۔ جب وہ اِن کے نہیں بنتے تو اُن کو کالا چور لے جائے۔ اِن کی بیزاری یہاں تک کہ مودودی صاحب جیسا آدمی بھی (جس کے کام کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے لئے، ان حضرات کے نزدیک اتنے خطرے چھپے ہوئے ہیں) اگر وہ ان کو اپنے گرد جمع کرے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، یہ بھی اسلام ہی کی خدمت ہو گی۔

اگر ان حضرات کے سوچنے کا انداز اسلامی ہوتا اور فی الواقع مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے کام کے اندر یہ حضرات وہی خطرے محسوس کرتے ہوتے جن کا صاحب تحریر نے اتنے سنجیدہ

لب ولہجہ میں ذکر فرمایا ہے تو یقیناً یہ نہ صرف اپنے مریدوں کو بلکہ تمام مسلمانوں کو، بلکہ تمام انسانوں کو اس فتنے سے بچانے کی کوشش کرتے۔ مگر ان حضرات کے پیشِ نظر صرف یہ چیز ہے کہ اس دھارے کا رخ اپنی جاگیر کی طرف سے ہٹا کر کسی اور طرف موڑ دیں اور اپنی انصاف پسندی کا مظاہرہ کرنے کے لئے نہایت ثقاہت کے انداز میں مسلمانوں کو یہ بتا دیں کہ ہے تو یہ دھارا بہت خطرناک لیکن اگر اس کا رخ فلاں سمت کی طرف مڑ جائے تو اس میں کچھ پہلو فوائد کے بھی ہیں۔ یہ ہمارے ان بزرگوں کا تورّع ہے۔

اسلام کے متعلق ان حضرات کا جو تصور ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ جس شخص کو یہ ایک مفسر اور فقیہ کی حیثیت سے ایک لمحہ کے لئے بھی قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں اسی شخص کو ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے تیار ہیں۔ "اقترابات" کی میزان میں جو شخص ان کے نزدیک پاسنگ کے برابر بھی نہیں ہے اسی شخص کو یہ "ارتفاقات" کی میزان میں پورا من بھر قرار دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ارتفاقات (اجتماعیات) کو اقترابات (وسائل قربِ الٰہی) سے الگ کر کے دیکھنے کا یہ انداز ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ سے نہیں سیکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں تو کسی شخص کا ارتفاقات میں بھی درجہ معین کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا تھا کہ اقترابات میں اس کا درجہ کیا ہے۔ اور اگر اقترابات میں اس کا پلہ ذرا بھی ہلکا نظر آتا تھا تو اسی کے بقدر اس کا پلہ ارتفاقات میں بھی ہلکا قرار دے دیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ اسلام نے اس کو پسند نہیں کیا ہے کہ دونوں چیزوں کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے۔ اسلام میں دین و دنیا کی تفریق نہیں ہے اور نہ قیصر اور خدا کے الگ الگ دائرے ہیں۔ یہاں جس طرح انفرادی زندگی خدا اور شریعت کے تحت ہے اسی طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی بھی خدا اور رسول کے احکام کے تحت ہے۔ اس لئے جس طرح خانقاہوں اور درسگاہوں کا نظام ان لوگوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا جو خدا ناشناس ہوں اسی طرح حکومت کا انتظام بھی ان لوگوں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا جو خدا اور اس کی شریعت کو اچھی طرح جاننے والے اور صدقِ دل سے ماننے والے نہ ہوں۔ لیکن ہمارے ان بزرگوں کا دین چونکہ عیسائیوں کے دین کی طرح اجتماعیات سے بے تعلق ہے اس وجہ سے یہ اس بات پر راضی ہیں کہ مودودی صاحب ان کے

اجتماعی وسیاسی لیڈر شوق سے بن جائیں اگرچہ دینی و شرعی نقطۂ نظر سے وہ قطعی گردن زدنی ہیں۔ ہمارے ان بزرگوں کے اسی راہبانہ نقطۂ نظر کا یہ فیض ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی اور سیاسی زندگی سو نی صدی ایسے لیڈروں کے قبضے میں چلی گئی جو نہ صرف خدا کی شریعت سے منحرف ہیں بلکہ خدا کے بندوں کو اس کی شریعت سے منحرف کرنے والے بھی ہیں۔ اور انھوں نے سیاسی طاقت حاصل کرنے کے بعد مسلمانوں کی پوری زندگی کو جاہلیت کے رنگ میں رنگ دیا ہے۔ صاحب تحریر بزرگ بھی اسی عام نظریہ کے مطابق مودودی صاحب کے لئے یہ حق تو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مسلمانوں پر مسلط ہو جائیں اور بے خدا سیاست شوق سے چلائیں لیکن یہ بات ان کو کھلتی ہے کہ وہ مذہبی اصولوں پر ایک جماعت بنائیں اور اس کے امیر کی حیثیت سے مسلمانوں کی ساری انفرادی، اجتماعی، اور سیاسی زندگی کو مسلمان بنانے کی جدوجہد جاری کریں۔ اس میں ان کو بے شمار خطرے نظر آتے ہیں۔

یہاں دل میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صاحب تحریر بزرگ نے جس فن ارتفاقات (اجتماعیات) میں مودودی صاحب کو از راہِ عنایت ایک اونچا مقام عنایت فرمایا ہے اس کے اصول و فروع قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں یا مغربی فلاسفۂ سیاست سے؟ اگر قرآن و حدیث ہی سے ماخوذ ہیں تو یہ امر تعجب انگیز ہے کہ ایک شخص کے بارے میں ایک طرف تو یہ تسلیم کیا جائے کہ قرآن و حدیث میں اتنا درک رکھتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو موجودہ زمانے میں یہ بتانے کا اہل ہے کہ اسلام ان کی اجتماعی و سیاسی زندگی کے لئے کیا اصول اور کیا ضابطے دیتا ہے اور اپنی اجتماعی اور قومی حیثیت میں وہ کس طرح اپنے رب سے ٹھیک ٹھیک جڑ سکتے ہیں لیکن دوسری طرف اسی شخص کو اتنا نااہل سمجھا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو یہ نہیں بتا سکتا کہ ان کے مختلف حالاتِ زندگی کے لئے شریعت کے احکام کیا ہیں، اور وہ اپنی انفرادی زندگیوں میں کس طرح اپنے رب کی معیت حاصل کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں ان میں سے زیادہ مشکل کام پہلا ہے یا دوسرا؟

اور اگر مودودی صاحب کے یہ ارتفاقات مغربی جاہلیت ہی سے ماخوذ ہیں تو پھر صاحب تحریر

بزرگ سے باادب گزارش ہے کہ آخر وہ کس بنا پر ایک ایسے شخص کی سیاسی قیادت تسلیم کرنے کے لئے تیار رہیں جو اپنے سیاسی واجتماعی نظریات میں مغربی فلاسفہ کا مرید ہے؟ کیا ہمارا دین اجتماعی اور سیاسی زندگی سے متعلق ہم کو نہایت تفصیلی ہدایات نہیں دیتا؟ اور کیا وہ ہدایات ہمارے لئے اسی طرح واجب التعمیل نہیں ہیں جس طرح وہ ہدایات واجب التعمیل ہیں جو ہماری انفرادی زندگیوں سے متعلق ہیں؟

بہرحال جماعت اسلامی اور اس کے امیر کو تھوڑا بہت ... جو یہ حضرات دیتے ہیں اس میں بھی ہمارے لئے کوئی پہلو تسلی کا نہیں ہے بلکہ یہ بھی ان حضرات کی ژولیدہ فکری اور ایک بڑی حد تک ان کے احساسِ کمتری کا نتیجہ ہے۔

ان تمہیدی معروضات کے بعد اب آپ اُن الزامات پر ایک ایک کر کے غور فرمائیے جو پوری متفیانہ شان احتیاط کے ساتھ اور تو بہ و استغفار کرتے ہوئے ہم پر لگائے گئے ہیں۔

(۱) سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ جماعت ایک فرقہ بنتی جارہی ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ "جماعت کے حلقے میں یہ زعم پیدا ہو رہا ہے کہ دین، دین کا فہم، دین کا درد، دین کا شعور بس اس جماعت میں محدود اور اسی دائرے میں مخصوص ہے۔"

اس الزام کے متعلق گزارش ہے کہ اول تو صاحب تحریر بزرگ کو یہی پتہ نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی فرقہ کس طرح بنا کرتا ہے۔ محض اتنی سی بات سے کہ کچھ لوگ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ دین کا علم بس ہمارے ہی پاس ہے اور ہم ہی اسلام کی خدمت کر رہے ہیں، وہ ایک فرقہ نہیں بن جاتے۔ اس کو ایک سخت قسم کی بدخودی، غلطی کہہ لیجیے، غرور بھی کہہ لیجیے، مگر یہ کہنا بڑی زیادتی ہے کہ انھوں نے اپنا ایک الگ فرقہ بنا لیا ہے۔ اگر اس طرح سے فرقے بن جایا کریں تو پاکستان اور ہندوستان کے جتنے علما اور مشائخ اپنے الگ الگ دائرے بنا کر کام کر رہے ہیں سب کو الگ الگ فرقوں کا بانی قرار دینا پڑے گا کیونکہ ان میں سے ایک شخص بھی شاید ایسا نہ نکلے جو یہ نہ سمجھتا ہو کہ جو کام وہ کر رہا ہے کوئی دوسرا نہیں کر رہا ہے۔ اور اگر اپنی نیک مزاجی کی وجہ سے وہ دوسروں کو

بھی کچھ وزن دے رہا ہے تو کم از کم اس کے معتقدین اور مریدین تو ہر گز اس بات کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ان کے "حضرت" کے سوا کسی اور کو بھی دین کا فہم اور دین کا علم حاصل ہے۔ پھر کیا یہ سب کے سب الگ الگ فرقے ہیں؟ خود صاحب تحریر نے بھی اپنے اسی مراسلے میں جگہ جگہ بڑی دور کی لی ہے۔ خصوصاً تصوف پر بحث کرتے ہوئے تو ان پر انا ولا غیری کا اتنا نشہ چڑھ گیا ہے کہ شیخ ابن عربی کا سکر بھی ان کے سکر کے آگے صحو بن کے رہ گیا ہے۔ لیکن محض اتنی بات کی وجہ سے ہم یہ نہیں سمجھتے کہ موصوف بھی کسی خاص فرقے کے بانی بن گئے ہیں بلکہ اس کو محض تنگ ظرفی پر محمول کرتے ہیں جو ایک بیماری ہے اور بہتوں کو لاحق ہو جایا کرتی ہے۔

فرقہ بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے اندر کوئی جماعت یا تو عقائد میں کوئی ایسی بات ایجاد کرلے جو کتاب و سنت کے بتائے ہوئے اور سوادِ اعظم کے اختیار کئے ہوئے عقائد سے مختلف ہو یا دین کے جو معروف اور مسلم ماخذ ہیں ان کے سوا اپنے لئے کوئی اور بھی ماخذ قرار دے لے۔ الحمد للہ صاحب تحریر بزرگ نے بعض دوسرے بزرگوں کی طرح اس قسم کا کوئی الزام جماعت پر نہیں لگایا ہے۔ اس لئے ہماری یہ باادب گزارش ہے کہ جب تک وہ جماعت پر کسی نئے عقیدے یا نئے ماخذِ دین کی ایجاد کا الزام نہیں لگالیتے اس وقت تک جماعت پر ایک فرقہ ہونے کا الزام لگانے میں بھی وہ توقف فرمائیں۔

ایک فرقہ ہونے کا الزام تو درکنار جماعت اسلامی پر ایک الگ فقہی مذہب ہونے کا الزام بھی نہیں لگایا جاسکتا۔ ایک الگ فقہی مذہب ہونے کے لئے بھی کم از کم پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ جماعت یا اس کے امیر نے اجتہاد کے کچھ ایسے اصول ایجاد کئے ہوں جو مذاہب اربعہ کے اصول اجتہاد سے مختلف ہوں لیکن معلوم ہے کہ ہم نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی ہے۔ صاحب تحریر بزرگ نے ہم پر نااہلیت اور غلط فتوے دینے اور غلط اجتہاد کرنے کے الزامات تو لگائے ہیں لیکن یہ الزام کہیں نہیں لگایا ہے کہ ہم نے ائمہ اربعہ کے اصولوں سے کچھ ایک اصول اجتہاد کے ایجاد کرلئے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم کو ایک الگ فرقہ قرار دینا تو درکنار وہ ایک الگ فقہی مذہب بھی

قرار دینے کا حق نہیں رکھتے۔

باقی رہی یہ بات کہ جماعت کے لوگوں کو یہ زعم ہے کہ "صحابہؓ کے بعد دین کو بہمہ شعبہ جات کماحقہٗ بس ہم نے سمجھا ہے" یا یہ کہ "ہم اصلی اور تحقیقی مسلمان ہیں دوسرے نسلی اور تقلیدی" تو یہ بات بالکل بہتان ہے۔ جماعت اسلامی اس قسم کی کسی غلط فہمی میں ہرگز مبتلا نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جماعت سے بدگمانی رکھنے والے حضرات پہلے تو خود اپنے دل میں یہ فرض کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی ایسا سمجھتی ہوگی، پھر خود ہی اپنے اس مفروضہ کو واقعہ کی شکل دے لیتے ہیں اور یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ جماعت اسلامی ایسا سمجھتی ہے۔ جماعت اسلامی جو کچھ سمجھتی ہے وہ تو بس اتنا ہے کہ آج پورے دین کو زندگی کے تمام انفرادی، اجتماعی اور سیاسی شعبوں میں قائم کرنے کی عملاً جدوجہد کرنے والی اور اس مقصد کے لئے آگے بڑھ کر لڑنے والی جماعت اُس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی جو کہی جاتی ہے تو بطور فخر و غرور کے نہیں کہی جاتی، کیونکہ یہ بات کوئی فخر کی بات بہر حال نہیں ہے، بلکہ بطور اظہارِ حسرت و افسوس کے کہی جاتی ہے کہ دین کی غربت اور حق کی بیکسی کا یہ عالم ہے کہ آج اس سرزمین پر باطل سے باطل مقاصد کے لئے بڑی بڑی پارٹیاں اور جماعتیں موجود ہیں لیکن اسلام ہی ایک ایسا مظلوم ہے جس کو زندگی کے ہر شعبے میں غالب کرنے کا حوصلہ رکھنے والی ایک چھوٹی سی جماعت، جماعت اسلامی کے سوا کوئی اور پارٹی موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جماعت اسلامی کا یہ احساس محض ایک احساس نہیں ہے بلکہ ایک واقعہ ہے جس کا کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمارے بزرگانِ دین چونکہ اس بات میں اپنی تحقیر محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح بالواسطہ اُن کی دینی خدمات کا انکار کیا جا رہا ہے اس لئے وہ اس کو اس شکل میں تعبیر کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے لوگ اپنے سوا کسی کو دین کا فہم و شعور رکھنے والا سرے سے سمجھتے ہی نہیں۔

جماعت کے طریقِ تنظیم کو بھی محض سطحی نظر سے دیکھ کر یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ وہ ایک نیا فرقہ بن رہی ہے اور سوادِ اعظم سے کٹ رہی ہے کیونکہ ہر مسلمان کو اپنے دائرے میں نہیں لے لیتی، اور مسلمانوں کے اندر نسلی اور اصلی کا فرق کرتی ہے، اور جماعت کے اندر اور باہر کا امتیاز کرتی ہے۔ لیکن دراصل یہ

ساری باتیں ہمارے نقطۂ نظر کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہیں۔

جماعت اسلامی نے اپنی تنظیم کی بنیاد اس اصول پر رکھی ہے کہ اس کے اندر صرف وہی لوگ شامل ہوسکتے ہیں جو اسلام کو اپنی انفرادی زندگی کا بھی دین مانتے ہوں اور اپنی اجتماعی اور سیاسی زندگی کا بھی۔ نیز وہ اپنی انفرادی زندگی کی حد تک اس پر پوری طرح عمل کرتے ہوں اور اپنی اجتماعی اور سیاسی زندگی میں اس کو جاری کرنے کے لئے جدوجہد کرنے کا عزم رکھتے ہوں۔ مجرد اس بنا پر کہ ایک شخص مسلمان گھرانے کے اندر پیدا ہوا ہے خواہ اسلام کے ساتھ وہ کوئی عملی واعتقادی وابستگی نہ رکھتا ہو، کوئی شخص اس جماعت میں داخل نہیں ہوسکتا۔

ظاہر ہے کہ آج مسلمانوں کی قوم ہر قسم کے افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں کتنے ہیں جو اسلام کے ساتھ اس کے سوا کوئی نسبت نہیں رکھتے کہ وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں۔ نہ وہ اسلام کے کسی حکم پر عمل ہی کرتے ہیں نہ اس کی کسی نہی سے بچتے ہی ہیں۔ کتنے ہیں جو اسلام کو صرف انفرادی زندگی ہی کا دین مانتے ہیں، اپنی اجتماعی زندگی کو شریعت کی پابندیوں سے وہ بالکل آزاد سمجھتے ہیں۔ کتنے ہیں جو اسلام کے اصولوں کے کھلم کھلا منکر ہیں بلکہ اسلام کا مضحکہ اڑانے سے بھی باز نہیں رہتے۔ اب اگر کوئی جماعت اس عزم کے ساتھ اٹھے گی کہ وہ مسلمانوں کے اندر پورے دین کو قائم کرے گی تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے اس مقصد میں اس طرح کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی کہ مذکورہ بالا تمام قسم کے مسلمانوں کی ایک فوج بھرتی کر لے۔ لامحالہ اسے یہی کرنا پڑے گا کہ وہ پہلے ان مسلمانوں کو چھانٹے جو اعتقاداً بھی مسلمان ہوں اور عملاً بھی، اور جو اسلام کو انفرادی زندگی کا دین بھی مانتے ہوں اور اجتماعی زندگی کا دین بھی۔ پھر وہ انہی کو دوسرے مسلمانوں کی اصلاح اور ان کو اپنی طرف کھینچنے کا ذریعہ بنائے۔ یہی کام جماعت اسلامی نے کیا ہے لیکن اس پر ہمارے یہ بزرگانِ دین برہم ہیں کہ جماعت اسلامی اصلی مسلمان صرف اپنے ارکان ہی کو سمجھتی ہے، باقی سارے مسلمانوں کو صرف نسلی مسلمان قرار دیتی ہے اور جماعت کے اندر اور جماعت کے باہر کے مسلمانوں میں امتیاز کرتی ہے۔

جماعت کے اندر اور جماعت کے باہر کے مسلمانوں میں جماعت اسلامی امتیاز تو بیشک کرتی ہے۔

لیکن انتہائی نادان ہوگا وہ شخص جو یہ سمجھے کہ یہ امتیاز کفر و اسلام کا ہے یا صالح اور غیر صالح کا ہے۔ یہ امتیاز دراصل صرف اس پہلو سے ہے کہ جماعت کے اندر وہ لوگ ہیں جو اصلاح کے کام میں ہمارے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں، اور اس مقصد کے لئے وہ خالص اسلامی اصولوں پر ایک جماعتی نظام میں منسلک ہو گئے ہیں جس کی بنا پر کوئی ان کو حکم دے سکتا ہے اور وہ اس کا حکم مان سکتے ہیں۔ باقی رہے جماعت سے باہر کے مسلمان تو وہ ہر قسم کے مسلمانوں پر مشتمل ہیں۔ ان میں اسلام سے بالکل بے خبر بھی ہیں اور اسلام سے باخبر بھی۔ ان میں صالح بھی ہیں اور فاسق بھی۔ ان میں اسلام کے دشمن بھی ہیں اور اسلام کے دوست بھی۔ اُن میں اسلامی نظام کے چاہنے والے بھی ہیں اور اسلامی نظام کے مخالفین بھی۔ ہم ان کے اندر کے تمام صالحین اور اخیار کو اپنی ہی جماعت کا آدمی سمجھتے ہیں۔ اگرچہ وہ ابھی ہم سے ملے نہیں ہیں لیکن ہم ان کو وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ کے حکم میں داخل سمجھتے ہیں اور یہ امید رکھتے ہیں کہ دیر یا سویر ہم ان سے مل جائیں گے یا وہ ہم سے مل کر رہیں گے۔ مقصد اور طریق کار کی یکسانی کے باوجود یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اور وہ زیادہ دنوں تک الگ الگ کرتے رہیں۔ اس وقت ہمارے اور ان کے درمیان جو علیحدگی ہے وہ بیشتر نتیجہ ہے ان کی طرف سے بعض بدگمانیوں کا اور ہماری جانب سے بعض کوتاہیوں کا۔ ہم نے اب یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم اپنی کوتاہیاں دور کر کے رہیں گے، وہ اپنی بدگمانیاں دور کریں یا نہ کریں۔ گو توقع ان کی طرف سے بھی ہم کو اچھی ہی ہے۔

(۲) دوسرا الزام جو صاحبِ تحریر بزرگ نے جماعت پر لگایا ہے وہ جہلِ مرکب کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "جماعت کا ہر شخص یا تو خود اپنے آپ کو اجتہاد کا مستحق سمجھتا ہے یا جماعت کے وابستہ اہل علم سے رجوع کرتا ہے، اور جماعت کے پورے حلقے میں ایک عالم بھی ایسا نہیں ہے جس کا علم اور تفقہ تفصیلی مسائل میں لائق اعتماد ہو۔ اس لئے ان کے بڑے بڑے مدعیانِ علم مسائل کے بارے میں فاحش اور مضحکہ انگیز غلطیاں کرتے ہیں ...... کتاب و سنت اور فقہائے امت کے استنباطات پر اُن کی نظر بہت کم ہے۔"

میں صاحب تحریر بزرگ اور ان کی طرح کے جماعت سے بے خبر اشخاص کی اطلاع کے لئے اس امر واقعی کا اظہار ضروری خیال کرتا ہوں کہ جماعت کے اندر ہر شخص کا اپنے آپ کو اجتہاد کا مستحق سمجھنا اور اجتہاد کرنا تو الگ رہا جماعت کا ہر شخص اپنے آپ کو تقریر کرنے کا بھی نہ مستحق سمجھتا ہے اور نہ بلا اجازت تقریر کرتا ہی ہے۔ صرف وہی لوگ تقریر کرسکتے ہیں جو اپنی اہلیت کی بناء پر جماعت کے اہل حل و عقد کی طرف سے اس کے لئے مجاز قرار دیئے گئے ہوں۔ جو جماعت اپنے ڈسپلن میں اتنی سخت ہو کہ ہر شخص کو تقریر کرنے کی بھی اجازت دینے کی روادار نہ ہو وہ ہر شخص کو اجتہاد کر ڈالنے کی چھوٹ کیسے دے سکتی ہے، درانحالیکہ ایک نااہل کا اجتہاد ایک نااہل کی تقریر سے اس کے لئے اور دوسروں کے لئے کہیں زیادہ فتنہ انگیز ہے۔ اگر اس قسم کے کچھ بر خود غلط ارکان جماعت کہیں موجود ہوں تو صاحب تحریر بزرگ اور ان کے ہم خیالوں سے ہماری گزارش ہے کہ ان کے ناموں اور ان کے اجتہادات کے کچھ نمونوں سے ہمیں ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ ہم جماعت کو ان کی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ کرسکیں۔

رہے جماعت کے اہلِ علم تو ان کی نسبت جس رائے عالی کا اظہار کیا گیا ہے وہ مدرسی اور خانقاہی حلقوں سے اکثر ہماری نسبت ظاہر کی جاتی رہی ہے اور ہم نے اس کا جواب دینے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس لئے کہ فی الواقع اس کا ہمارے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں آخر جو لوگ ہمیں یہ کہتے ہیں کہ تم عالم فاضل نہیں ہو تو ہم ان کے جواب میں کیا یہ کہیں کہ نہیں تم جھوٹ کہتے ہو، ہم تو بڑے عالم فاضل ہیں اور ہمارے پاس یہ یہ سندیں اور یہ یہ تصدیقیں ہمارے علم و فضل اور تبحر کی شہادت میں موجود ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ تو تو میں میں کچھ اچھی چیز نہیں ہے۔ اس لئے ہم اپنے ان بزرگوں کی لن ترانیوں کے جواب میں ہمیشہ خاموش ہی رہے۔ ہم نے خیال کیا کہ زمانہ خود بہترین جج ہے۔ وہ خود اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ ہم کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ جن لوگوں نے اپنے آپ کو میدان میں اس لئے اتار دیا ہے کہ وہ زمانے سے لڑیں گے اور باطل پر حق کو غالب کر کے رہیں گے یا اس کشمکش میں اپنے آپ کو مٹا دیں گے ان کی قابلیتوں کی شہادت ـــــــ

اگرفی الواقع ان کے اندر کوئی قابلیت موجود ہے ـــــ خود زمانہ داد دے گا۔ ان کے لئے مدعیوں اور خانقاہوں کی تصدیق کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس معاملہ کو خدا کے حوالے کر کے کہ وہی تمام علم وفضل کا منبع ہے، چپ ہی رہے اور اب بھی جہاں تک اس جھگڑے کا تعلق ہے ہم چپ ہی رہتے۔ لیکن صاحب تحریر بزرگ نے ہماری بہت سی فاحش اور مضحکہ انگیز غلطیوں کا اجمالی طور پر حوالہ دے کر چھوڑ دیا ہے بتایا نہیں ہے کہ وہ غلطیاں کیا ہیں، یقیناً یہ غلطیاں بہتوں کے لئے ٹھوکر اور گمراہی کا سبب ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ہم صاحب تحریر بزرگ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان فاحش اور مضحکہ انگیز غلطیوں سے ہمیں ضرور آگاہ فرمائیں تاکہ ہم ان کی اصلاح کر سکیں۔ اور اگر موصوف کو ہم سے کسی اصلاح کی توقع نہ ہو تو پبلک ہی کو ان غلطیوں کی تفصیل سے آگاہ فرما دیں تاکہ لوگ ان سے محفوظ رہ سکیں۔

ایک اور بات کی یہاں تھوڑی سی وضاحت ہو جائے تو اچھا ہے کہ "تفصیلی مسائل" سے ہمارے ان بزرگوں کی کیا مراد ہے جس کے علم وتفقہ میں جماعت کا ایک صاحب علم بھی لائق اعتماد نہیں ہے؟ کیا اس سے مراد اس طرح کے مسائل ہیں کہ اگر کسی کوئیں میں چوہیا مر جائے تو وہ کتنے ڈول پانی نکالنے سے پاک ہوگا؟ اگر یہی مراد ہے تو میں صاحب تحریر بزرگ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ جماعت کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو اس "تفقہ" میں آپ حضرات سے اگر آگے نہیں تو پیچھے بھی نہیں ہیں۔ اور اگر اس سے مراد وہ مسائل ہیں جو موجودہ زمانے کی روزمرہ زندگی میں نئی تہذیب کے تصادم سے پیش آ رہے ہیں تو اس طرح کے مسائل سے تعرض کرنے والی اگر کوئی جماعت آج موجود ہے تو یہی جماعت اسلامی ہی ہے۔ یہ الگ سوال ہے کہ وہ اس کی اہل ہے یا نہیں مگر چونکہ کوئی اور اہل تر جماعت آج اس کام کے لئے آگے نہیں آ رہی ہے اس لئے تمدنی، اجتماعی، اور سیاسی مسائل میں جماعت اسلامی نے اسلام کا نقطۂ نظر واضح کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے۔ اگر کوئی جماعت ایسی موجود ہے جو ان مسائل میں اپنے علم وتفقہ کو جماعت اسلامی کے علم وتفقہ سے زیادہ لائقِ اعتماد سمجھتی ہے تو بسم اللہ وہ آگے بڑھے، جماعت اسلامی اس کے پیچھے چلے گی۔

ناا ہلوں کو تو آگے بڑھنے کا موقع دیا ہی اس چیز نے ہے کہ جو اہل تر تھے انھوں نے اپنی ذمہ داریاں محسوس نہیں کیں۔

مولانا مودودی کا علم و مطالعہ مدرسی اور خانقاہی حلقوں میں اکثر زیر بحث رہا ہے اور میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ اس معاملہ میں لوگوں کا غرور علم اکثر اعتراف حق پر غالب آیا ہے۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ مودودی صاحب نے کہاں پڑھا ہے اور کیا پڑھا ہے، لیکن میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ نہایت ذہین آدمی ہیں، نہایت قابل آدمی ہیں، اور نہایت وسیع النظر عالم ہیں۔ ان کا مرتبہ صرف اس پہلو ہی سے اونچا نہیں ہے کہ وہ جدید علوم و افکار پر نہایت وسیع نگاہ رکھتے ہیں، اور ایک بلند پایہ انشا پرداز ہیں بلکہ ان کی اصلی خوبی یہ ہے کہ وہ کتاب و سنت پر نہایت گہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں۔ قرآن کا انھوں نے ایک اسکالر کی طرح مطالعہ کیا ہے اور برابر اس پر تدبر کرتے رہتے ہیں۔ صرف بیضاوی اور جلالین "بقدرِ نصاب" پڑھ کر مفسر نہیں بن بیٹھے ہیں۔ انھوں نے حدیث کی تمام مستند کتابوں کو حرف حرف نہایت غور و فکر کے ساتھ پڑھا ہے، صرف ان کے "دورہ" پر اکتفا نہیں فرمایا ہے۔ اسی طرح فقہ، اصول، سیرت اور رجال کی تمام ضروری کتابیں ان کی نگاہوں سے گزری ہوئی ہیں۔ ان کے مطالعہ کا طریقہ بھی محققانہ ہے۔ میں ۲۰ ماہ ان کے ساتھ جیل میں رہا ہوں اور میں نے نہایت قریب سے ان کو دیکھا ہے کہ وہ کس طرح کی چیزیں پڑھتے ہیں، کس طرح پڑھتے ہیں اور کس قدر پڑھتے ہیں۔ انھوں نے صرف جیل کے قیام کے دوران میں عام علوم و فنون کے سوا تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور رجال کی اتنی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے کہ میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو حضرات ان کے مطالعۂ کتاب و سنت پر باندازِ استخفاف تبصرہ فرماتے ہیں اُن کو شاید مدۃ العمر اتنی کتابیں پڑھنے کی سعادت نہیں حاصل ہوئی ہو گی۔ میں نے جب کبھی ان کی کوئی پڑھی ہوئی کتاب کسی ضرورت کے لئے اٹھائی تو حدیث اور فقہ کی موٹی موٹی کتابوں پر بھی دیکھا ہے کہ ان کے تمام اہم یا قابلِ تنقید مقامات پر حاشیہ میں خود اُن کے قلم سے مفید نوٹ موجود ہیں۔ وہ عربی زبان کو عالمانہ طور پر سمجھتے ہیں، حاطب اللیلوں کی

طرح ہوائی تیر تکے نہیں چلاتے۔ جیل کے دورانِ قیام میں مجھے بعض اوقات عربی کی بعض مشکل یا غلط چھپی ہوئی عبارتوں کے بارے میں اُن کے مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا ہے اور میں نے ہر مرتبہ یہ محسوس کیا کہ وہ عبارت کا تجزیہ کرنے اور کلام کی نحوی تالیفات سمجھنے میں مدرسی مولویوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ پھر کام کو وہ جس ذمہ داری کے ساتھ کرتے ہیں اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی تقریر بھی اس وقت تک کرنا پسند نہیں کرتے جب تک اس کے لئے اچھی طرح تیاری نہ کرلیں ——— اگر ایک ایسے شخص پر بھی کتاب وسنت کے علوم کے بارے میں ہم اعتماد نہیں کرسکتے تو پھر میں نہیں سمجھتا کہ کتاب وسنت کے علم کے بارے میں اس ملک میں کس شخص پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

(۳) صاحبِ تحریر بزرگ نے سب سے زیادہ دردانگیز الفاظ میں جو الزام ہم پر لگایا ہے وہ تصوف کے انکار اور اکابرِ تصوف کی تحقیر کا ہے۔ اس الزام کے پہلے حصے کے متعلق تو یہ گزارش ہے کہ ہم نے تصوف کی مخالفت جس پہلو سے اور جن وجوہ سے کی ہے انھیں مولانا مودودی نے اپنی کتابوں اور مضامین میں نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کردیا ہے اور میں نے بھی اپنے رسالہ "حقیقتِ تقوی" میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ جو شخص چاہے ان رسائل کی مدد سے ہماری مخالفت کی حقیقت اور اس کے اسباب ووجوہ معلوم کرسکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اکابرِ تصوف کی کسی نوعیت سے کوئی تحقیر کی ہے۔ وہ تمام اکابر صوفیہ جنھوں نے دین کی خدمتیں انجام دی ہیں ہمارے نزدیک بھی اسی طرح محترم ہیں جس طرح صاحبِ تحریر بزرگ کے نزدیک وہ محترم ہیں لیکن اس احترام کے لئے ہم یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ ان کو بالکل معصوم بنا کے چھوڑ دیں اور ان کو وہ درجہ دے دیں جو ہمارے دین میں صرف اللہ کے رسول کو دیا گیا ہے۔ اگر کسی شخص کے احترام کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس پر کسی پہلو سے کوئی تنقید ہی نہ کی جائے تو ہم اس کو احترام نہیں سمجھتے بلکہ بت پرستی سمجھتے ہیں اور اس بت پرستی کو مٹانا منجملہ ان مقاصد کے ایک اہم مقصد ہے جن کو جماعت اسلامی اپنے پیشِ نظر رکھتی ہے۔ جو شخص ہمارے لٹریچر کو پڑھتا رہا

بجائے اس کے کہ وہ شاہ ولی اللہ صاحب، مجدد صاحب اور دوسرے بزرگوں سے متنفر ہو، یہ محسوس کرتا ہے کہ ہم اسی کام کو انجام دینا چاہتے ہیں جس کو ان بزرگوں نے انجام دینا چاہا تھا، اور اس کام میں ان بزرگوں کی رہنمائی سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں، لیکن اس فائدہ اٹھانے میں ہم اُس کسوٹی سے بھی کام لے رہے ہیں جو صحیح اور غلط کے پرکھنے کی واحد کسوٹی ہے اور جس پر جانچے بغیر کسی بڑے سے بڑے بزرگِ دین کی بات کو مان لینا بھی ہمارے دین میں ایک صاحب علم کے لئے حرام ہے۔ اس کسوٹی کا نام ہے کتاب اور سنت۔ ہمارے صاحبِ تحریر بزرگ نے بھی یہ نام بار بار لیا ہے لیکن معلوم نہیں وہ اس کے مصرف سے بھی واقف ہیں یا نہیں؟

تصوف کے متعلق جماعت اسلامی بحیثیت ایک جماعت کے تو کوئی مسلک نہیں رکھتی کیونکہ وہ اس طرح کے مسائل کا فیصلہ کرنے کے لیے نہیں بنی ہے۔ اور مودودی صاحب کا نظریہ اس معاملہ میں بہت نرم ہے، جیسا کہ تجدید و احیاء دین اور رسالۂ دینیات سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ میں مروجہ تصوف کو بدعت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس کو اس احسان سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے جو شریعت میں مطلوب اور معتبر ہے۔ احسان کی کوئی اپنی خاص شکل و صورت شریعت سے الگ نہیں ہے۔ اس کی حقیقت تو بس اس قدر ہے کہ آدمی اللہ کی شریعت پر پورے صدقِ دل اور پورے حضورِ قلب کے ساتھ اس کی روح اور حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے عمل کرے۔ دنیا میں انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد لوگوں کا تزکیہ ہے اور وہ اپنے اس اصلی مقصد کو کبھی ناتمام چھوڑ کے نہیں جاتے کہ دوسرے لوگوں کو اس کے اصول و فروع مرتب کرنے پڑیں۔ اگر دوسرے لوگ ایسا کریں تو خلق اور خالق دونوں کے نزدیک ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی ہر بات کے متعلق ثبوت بہم پہنچائیں کہ انھوں نے یہ بات قرآن کی کس آیت سے یا پیغمبر کی کس حدیث سے اخذ کی ہے۔ اس معاملے میں نہ کسی شخص کا مجرّد ذوق معتبر ہے اور نہ کسی شخص کا کشف و حال قابلِ لحاظ ہے۔ اور یہ کہنا تو انتہا درجہ کی ضلالت ہے کہ تزکیہ کے یہ رموز کسی خاص شخص یا چند خاص اشخاص ہی کو معلوم ہو سکے، دوسروں پر پیغمبر صلعم نے ان کو نہیں

کھولا۔ یہ اسلام میں باطنیت کی بنیاد رکھنا ہے اور دینِ اسلام کی روح اس باطنیت کا قلع قمع کرنا چاہتی ہے۔ جو لوگ یہ بات کہتے ہیں وہ خدا کے رسول پر سب سے بڑی تہمت لگاتے ہیں اور ہزار ہا فتنوں کے دروازے کھول رہے ہیں۔

ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف کی جو مخالفت کی ہے اس کو صاحبِ تحریر بزرگ نے "اعراض" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ حالانکہ انھوں نے صرف اعراض نہیں کیا ہے بلکہ تصوف کی نہایت مدلل مخالفت کی ہے اور صرف اس کی مخالفت ہی نہیں کی ہے بلکہ اس کی جگہ پر کتاب و سنت سے اُس احسان کے اصول بھی مرتب کر دیے ہیں جو اسلام میں معتبر ہے۔ پھر ان کی مخالفت کی نوعیت بھی ایسی نہیں ہے کہ آدمی اس کو معلوم کرنے کے بعد بغیر اس کے بارے میں یکسو ہوئے چین کی نیند سو سکے۔ ہمارے اکابرِ تصوف اور ابنِ تیمیہ کے نقطۂ نظر کے اختلاف کا ایک سرسری اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ حضرات شیخ ابن عربی کو شیخ اکمل سمجھتے ہیں اور تصوف میں سارا مدارِ سخن انھی پر رکھتے ہیں۔ لیکن ابنِ تیمیہ کے پاس ان کے لئے دجال سے کم کوئی لفظ ہی نہیں ہے۔ ابنِ تیمیہ سارے تصوف کو بدعت اور ضلالت قرار دیتے ہیں۔ یوں تو انھوں نے تقریباً اپنی ساری ہی کتابوں اور سارے ہی رسائل میں کسی نہ کسی پہلو سے تصوف پر تنقید کی ہے لیکن خاص طور پر ایک شیخ تصوف کی ایک تصنیف کو انھوں نے تنقید کے لئے انتخاب کیا اور اس پر تنقیدی نوٹ لکھے جن کو بنیاد قرار دے کر ان کے شاگرد علامہ ابنِ قیم نے مدارج السالکین لکھی جو ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کتاب میں صوفیہ کے تصوف پر ابنِ قیم نے پوری تفصیل کے ساتھ تنقید کر کے یہ دکھایا ہے کہ کس طرح یہ تصوف قدم قدم پر کتاب و سنت سے منحرف ہے۔ میری نگاہ سے آج تک فنِ تنقید پر اس سے زیادہ عالمانہ اور اس سے زیادہ منصفانہ کتاب کوئی اور نہیں گزری۔ اس کتاب نے ایک طرف تو بدعی تصوف کے بخیے ادھیڑ ڈالے دوسری طرف احسان کے تمام مقامات و مدارج کی کتاب و سنت کے نہایت واضح دلائل کے ساتھ تفصیل کر دی ہے۔ اس کو پڑھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ تصوف میں کیا خرابیاں ہیں،

کن پہلوؤں سے اس نے ہمارے تمام معیارات بدل ڈالے ہیں اور کس طرح اس کو صحیح مان لینے کے بعد یہ لازماً ماننا پڑتا ہے کہ انبیاء بالخصوص خاتم الانبیاء اور صحابہ تقویٰ اور تزکیہ کے لحاظ سے معیاری لوگ نہیں تھے۔ ابن قیم نے تمام مقامات کی تشریح کرکے یہ دکھایا ہے کہ ان حضرات نے اپنا منتہا کتاب و سنت کے مقرر کئے ہوئے منتہا سے ہر میدان میں آگے مقرر کیا ہے جس کے سبب سے ایک طرف تو کتاب و سنت نگاہوں سے گرتے ہیں اور دوسری طرف امت میں رہبانیت کی بیماری پھیلتی ہے۔ کیونکہ ہر معاملے میں صحیح فطری اور عملی حد وہی ہو سکتی ہے جو شریعت نے مقرر کردی ہے۔ اگر کوئی شخص اس حد سے آگے بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے گا تو وہ لازماً اپنی فطرت سے جنگ کرے گا اور رہبانیت کے دروازے کھولے گا۔

جن لوگوں نے اتنی وضاحت کے ساتھ اپنا موقف بیان کردیا ہے اور صرف اپنے ہی لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی یہی راہ دکھائی ہے ان کو ہمارے صاحب تحریر بزرگ صرف "اعراض" کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ میں صاحب تحریر بزرگ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ مدارج السالکین پڑھیں۔ اس سے انھیں ایک حد تک اندازہ ہوسکے گا کہ تصوف کے متعلق جو رائے ظاہر کر رہا ہوں وہ محض خیرہ سری اور بدذاتی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ارباب تصوف کا پورا احترام ملحوظ رکھنے کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ تصوف اور احسان دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ ان کو جن لوگوں نے بھی ایک سمجھا انھوں نے غلطی کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے اکثر کی نیتیں نیک ہوں۔

ان واجب الاحترام بزرگوں کی غلطیاں گنانا کوئی خوشگوار کام نہیں ہے لیکن اپنے مدعا کو واضح کرنے کے لیے ایک آدھ مثال کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ میں صاحب تحریر بزرگ ہی کی تحریر سے ایک مثال تصوف کی خوفناک بدعتوں کی پیش کرتا ہوں۔ ہمارے صاحب تحریر بزرگ ارشاد فرماتے ہیں:۔

نقشبندیہ اور خصوصاً مجدد سرہندیؒ نے تصور شیخ تک کو استعمال کرایا جو بعید خطرناک

[1] شاید بدتمیزی اس لئے ہے کہ ان بزرگوں کی وفات پر چند صدیاں گزر چکی ہیں اور غصہ کے اصل مستحق معاصرین ہوا کرتے ہیں۔

اور محدود تر طریقہ ہے۔ محض اس لئے کہ جانتے تھے کہ لوگ عموماً خوگر پیکر محسوس ہیں۔ صورتِ محسوس کے بغیر مجرد معنی تک وصول کی صلاحیت ہی نہیں۔ محسوس پرستی کا ذوق اس قدر مسلط ہے اور تجرید و تفرید معانی سے اس قدر عاری ہیں کہ بغیر اس کے خدا کا تصور و تمکن قلوب میں ہوتا ہی نہیں۔ سالہا سال کی اصنام پرستی، صورت پسندی اور اِجْعَلْ لَنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ اور لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً کی بدذوقی نے تنزیہی الوہیت، بے شبہ و مثال، بے کیف و لون، بے جہت و قیاس خدا کا تصور دشوار تر کر دیا، اور وصول ہے ضروری، لہٰذا ہوائی سفر کے بجائے اگر چھکڑے ہی کے ذریعے قطع مسافت ممکن ہو تو یوں ہی سہی مقصد تو وصول ہے"۔

اس عبارت کو پڑھ کر حضرت مجدد سرہندی، حضرات نقشبندیہ اور صاحبِ تحریر بزرگ کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے، چند باتیں پوچھنے کو جی چاہتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اس دلیل کی بنا پر کہ لوگ پیکر محسوس کے خوگر ہیں اور بغیر کسی پیکر محسوس کے ایک بے جہت و بے قیاس خدا کا تصور نہیں کر سکتے، ان کو تصور شیخ کا طریقہ استعمال کرایا جا سکتا ہے، تو آخر ہندوؤں کی بت پرستی اور مظاہر پرستی میں کیا قباحت ہے؟ ان کے فلسفی بھی تو یہی کہتے ہیں کہ لوگ ایک مجرد حقیقت کا تصور نہیں کر سکتے اس لیے ناگزیر ہے کہ ان کو اس کا تصور محسوس مظاہر کی شکل میں کرایا جائے۔ مقصود تو حقیقتِ مجرد تک پہنچنا ہے، لہٰذا ہوائی جہاز کے ذریعے اگر سفر نہیں ہو سکتا تو چھکڑے ہی کے ذریعے ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے! ہندوستان کے ہندو ہی نہیں بلکہ عرب کے بت پرست بھی بتوں کی پوجا کچھ اس لیے نہیں کرتے تھے کہ ان کو خداوندِ عالم سمجھتے تھے بلکہ ان کو وہ خدا تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اُن کی بُت پرستی تو شرک قرار پائے اور آپ کا تصور شیخ توحید؟ ——— یہی باتیں ہیں جن کے سبب سے بہت سے لوگ تصوف کو برہمنوں کے جوگ سے ماخوذ بتاتے ہیں اور ہمارے صاحبِ تحریر بزرگ کی مذکورہ بالا تقریر سے ان کے خیال کی پوری پوری تائید ہو رہی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانوں کی فطرت اور اس فطرت کے تقاضوں، اس کی بیماریوں اور اس کے علاج کو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء بہتر جانتے ہیں یا مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ؟ اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء بہتر جانتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ نے اس سلسلے میں جو طریقہ اختیار فرمایا وہ صریحاً اللہ تعالیٰ اور اس کے نبیوں کے اختیار کیے ہوئے طریقے سے مختلف ہے؟ بنی اسرائیل نے جب حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا کہ اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (ہمارے لئے بھی اس قسم کا معبود بنا دے جس قسم کے معبود ان بت پرست قوموں کے پاس ہیں) تو یقیناً انھوں نے یہ مطالبہ اسی وجہ سے کیا تھا کہ وہ صورتِ محسوس کے بغیر مجرد معنی تک وصول کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے لیکن اس کے جواب میں حضرت موسیٰ نے بجائے اس کے کہ ایک بت گھڑ کے ان کے سامنے رکھ دیتے، یا ان کو تصورِ شیخ کا نسخہ استعمال کرا دیتے، فرمایا کہ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا (بدبختو، کیا میں خدا کے سوا تمہارے واسطے کوئی اور معبود لاؤں) انھوں نے اس کا ذرا لحاظ نہ کیا کہ یہ بیچارے خوگرِ پیکرِ محسوس ہیں اور ابھی ابھی مصر کے بت پرستانہ ماحول سے نکلے ہیں اس لئے ایک بے شبہ و بے مثال خدا کا تصور نہیں کر سکتے، اور مستحق ہیں کہ ان کو ایک بچھڑا بنا کر دیدیا جائے، مقصود تو پہنچنا ہے، خواہ بُت ہی کے ذریعہ پہنچیں صنم ہی تک سہی۔

نہ صرف یہ کہ انھوں نے ان کو کوئی بت بنا کر دیا نہیں بلکہ ان کی عدم موجودگی میں جب بنی اسرائیل نے از خود ایک بچھڑا بنا لیا تو انھوں نے طور سے واپسی پر اس کو بھی ریزہ ریزہ کر کے سمندر میں پھنکوا دیا اور ان تمام لوگوں کو جو اس بت کے بنانے میں شریک رہے انھی کے بھائی بندوں کے ہاتھوں قتل کرا دیا اور ذرا اس بات کا خیال نہ کیا کہ یہ بیچارے خوگرِ پیکرِ محسوس تھے، ان کو ہوائی جہاز میسر نہیں آیا تھا اس لیے چھکڑے ہی پر سوار ہو لئے تھے۔

اسی طرح بنی اسرائیل نے جب یہ کہا کہ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (ہم تمہاری بات اس وقت تک نہیں ماننے کے جب تک اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں) تو اس وقت بھی انھوں نے اپنی اسی کمزوری کا اظہار کیا تھا جس کمزوری کے مداوا کے لیے حضرات نقشبندیہ نے

تصورِ شیخ کا نسخہ تجویز فرمایا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس کمزوری کا لحاظ فرمانے کے بجائے پہلے تو ان کو ڈانٹا کہ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے، تمہاری رسائی میری صفات کے مشاہدہ سے آگے نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی جب وہ اپنی ضد پر مصر ہی رہے تو بجائے اس کے کہ ان کی کمزوری پر رحم کر کے ان کو تصورِ شیخ کا نسخہ استعمال کرا دیا جاتا ان کو خدا کی طرف سے ایک کڑک نے آدبوچا۔

ہیکلِ محسوس کے خوگروں کے لیے خدا اور اس کے نبی کا اختیار کیا ہوا طریقہ اور علاج تو یہ ہے جو بیان ہوا لیکن مجدد صاحب اور حضرات نقشبندیہ کا طریقۂ علاج، صاحبِ تحریر بزرگ کے بقول، اس سے بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے اس خیال سے کہ لوگ حقیقتِ مجردہ کا تصور نہیں کر سکتے ان کو تصورِ شیخ کا رستہ دکھا دیا۔ اب بتائیے کہ ایک مسلمان جو خدا اور اس کے نبیوں پر ایمان رکھتا ہے ان میں سے کس کے طریقے کو اپنے لئے پسند کرے؟ اللہ اور اس کے رسول کے طریقے کو یا مجدد صاحب اور حضراتِ نقشبندیہ کے طریقے کو؟

تیسری گزارش یہ ہے کہ صاحبِ تحریر بزرگ فرماتے ہیں کہ "ہوائی سفر کے بجائے چھکڑے ہی کے ذریعے اگر قطعِ مسافت ممکن ہو تو یوں ہی سہی مقصود تو وصول ہے"۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر موٹر میسر نہ آئے تو چھکڑے پر بھی سفر کیا جا سکتا ہے بلکہ پیدل بھی چلا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال "وصول" کے متعلق ہے کہ آپ پہنچنا کہاں چاہتے ہیں؟ خدا تک یا کہیں اور؟ اگر خدا تک پہنچنا پیشِ نظر ہے تو لامحالہ آپ کو وہاں تک پہنچنے کے لئے وہی طریقے اختیار کرنے ہوں گے جو خدا نے اپنے تک پہنچنے کے لئے بتائے ہیں۔ اس طریقے کے سوا کوئی اور طریقہ اختیار کر کے آپ خدا تک نہیں پہنچ سکتے۔ اگر تصورِ شیخ خدا تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہے اور کتاب و سنت سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے تو اس سے بحث نہیں کہ یہ چھکڑا ہے یا موٹر، آپ شوق سے اس پر سوار ہو جائیے ہم آپ کو ہرگز نہیں روکتے۔ لیکن اگر یہ کوئی ذریعہ سرے سے ہے ہی نہیں، یا خدا تک پہنچانے کے بجائے خدا سے پھیرنے والا ذریعہ ہے تو اس کو اختیار کر کے آپ خدا تک نہیں پہنچیں گے بلکہ ہلاکت کے کسی گڑھے میں جا گریں گے۔ ہاں اگر مقصود بس کہیں نہ کہیں پہنچ جانا ہے، کوئی منزل معین نہیں ہے۔

توہمیں ایسے جادہ پیماؤں سے بحث نہیں ہے، وہ جس وادی میں چاہیں بھٹکتے پھریں۔

بہرحال ہم جو تصوف کو بدعت کہتے ہیں وہ ارباب تصوف کی اس قسم کی کتاب وسنت سے ہٹی ہوئی باتوں ہی کی بنا پر کہتے ہیں۔

صاحب تحریر بزرگ نے تصوف کی حمایت میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت بھی نقل کی ہے لیکن امام غزالی کی شہادت ان لوگوں کو کیا مطمئن کر سکتی ہے جو ہر معاملہ میں کتاب وسنت کی دلیل ڈھونڈتے ہوں۔ امام غزالی کے متعلق یہ نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے نبوت کی حقیقت اور خاصیت صوفیوں کے طریقوں سے سمجھی ہے۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو لیکن انھوں نے نبوت کی حقیقت کیا سمجھی ہے یہ سوال بجائے خود بڑا اہم ہے۔ امام غزالی کی تصنیفوں سے جو حضرات اچھی طرح واقف نہیں ہیں، محض ان کے نام ہی سے مرعوب ہیں، وہ ان کو جو چاہیں بنا کے رکھ دیں لیکن جن لوگوں نے ان کی تصنیفات اچھی طرح پڑھی ہیں وہ جانتے ہیں کہ وہ فلسفۂ یونان کے چکر سے آخر تک پوری طرح نہ نکل سکے۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں فلسفۂ یونان کی جتنی تردید کی ہے اس سے زیادہ فلسفۂ یونان کے غلط نظریات کو دین کی سند دی ہے۔ صاحب تحریر بزرگ نے امام صاحب کے جن رسائل کا حوالہ دیا ہے وہ اگر پسند فرمائیں تو میں انھی رسائل سے متعدد باتیں ایسی نکال دے سکتا ہوں جو امام غزالی نے فلسفہ یونان سے لی ہیں قرآن اور حدیث سے ہرگز نہیں لی ہیں۔ سرسید مرحوم نے بیشتر امام غزالی ہی کی کتابوں کو اپنے مجددانہ نظریات کی بنیاد رکھی ہے اور ان نظریات ہی کی بنا پر مولوی حضرات نے ان کو بُرا بھلا کہا ہے۔ خود نبوت کے مسئلے پر مجھے امام صاحب کی رائے سے شدید اختلاف ہے اور میں ان کی اس رائے کو فلسفۂ یونان سے مرعوبیت کا نتیجہ سمجھتا ہوں۔ علامہ ابن تیمیہ کی رائے تو ان کے متعلق یہ ہے کہ دخل فی بطن الفلسفۃ فلم یخرج منہا (وہ فلسفہ کے پیٹ میں گھسے اور پھر اس سے نکلنا نصیب نہ ہوا) اسلامی نقطۂ نظر سے ان کی مفید ترین کتاب "احیاء العلوم" ہے۔ بالخصوص محبت الٰہی وغیرہ موضوعات پر اس کی جو بحثیں ہیں وہ نہایت بیش قیمت ہیں لیکن اس

میں بھی صوفیانہ طرزِ فکر کی وہ ساری خرابیاں موجود ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

(۴) چوتھا بڑا الزام مودودی صاحب اور جماعت اسلامی پر یہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے براہِ راست کتاب و سنت سے سمجھنے کے مدعی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہم لوگ ہمیشہ دین کو کتاب و سنت ہی کے ذریعے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب جیسا کہ صاحب تحریر بزرگ نے سمجھا ہے، ہرگز نہیں ہے کہ ہم تمام فقہاء و محدثین اور ان کی تمام فقہی اور دینی خدمات سے بالکل مستغنی ہو گئے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ماضی یا حال کے رجالِ دین کی چیزیں جب پڑھتے ہیں تو صرف انھی کی آنکھوں سے نہیں دیکھتے بلکہ اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھتے ہیں اور ان کی ہر بات کو جانچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو بات وہ کہہ رہے ہیں اس کے لیے ان کے پاس کیا دلیل ہے اور اس دلیل کا کیا وزن ہے؟ یہ ہم اس لیے کرتے ہیں کہ ایسا کرنا عقیدۂ توحید کا لازمی تقاضا ہے۔ ایسا نہ کرنے ہی سے دنیا میں آبا پرستی کی بنیاد پڑی ہے اور خدا کے بندوں کا خدا کی شریعت سے رشتہ ٹوٹا ہے۔ اس بات کی تاکید ہمیں جس طرح قرآن و حدیث میں کی گئی ہے اسی طرح اس کی تاکید خود ان بزرگ ائمۂ دین نے بھی کی ہے جن کی اندھی تقلید پر جینا اور مرنا آج نجات کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے واضح ہدایات امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ہیں انھوں نے مختلف الفاظ میں بار بار اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ جو شخص یہ نہ جانے کہ فلاں بات ہم نے کتاب و سنت کی کس دلیل کی بنا پر کہی ہے وہ ہماری اس بات کی بنا پر فتویٰ نہ دے۔

باقی رہی یہ بات کہ ہم اجتہاد کرتے ہیں تو اس کی نسبت بھی نہایت واضح الفاظ میں یہ ظاہر کیہ دنیا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم اپنی مادی زندگی کے باقی رکھنے کے لئے جتنا ضروری ہوا اور پانی کو سمجھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ضروری اپنی روحانی زندگی کے لیے ہم اجتہاد کو سمجھتے ہیں۔ اس معاملے میں ہماری ضرورتیں دوسروں کی ضرورتوں سے بالکل مختلف ہیں۔

دوسروں کا دین ان کی زندگی کے ایک نہایت ہی محدود حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے چند

لگے بندھے ضابطے ہیں اور وہ اس محدود دائرے کے اندر، اگر ان کا جی چاہتا ہے، اس کی پیروی کر لیتے ہیں۔ زندگی کے باقی گوشوں میں ان کو اس سے بحث نہیں کہ وہ کس کی پیروی کرتے ہیں، خدا کی یا شیطان کی۔ لیکن ہمارا دین ہماری زندگی کے ہر گوشے پر حاوی ہے۔ وہ ہماری انفرادی زندگی کا بھی دین ہے اور ہماری اجتماعی زندگی کا بھی دین ہے۔ اور ہم اپنی زندگی کے کسی گوشے میں بھی اس سے بالارادہ انحراف کو کفر و فسق سمجھتے ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے جتنے معاملات بھی آئیں ہم ان پر غور کر کے یہ دیکھیں کہ ان کے بارے میں ہمارے دین کی رہنمائی کیا ہے۔ کچھ معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں کتاب و سنت میں نہایت واضح احکام مل جاتے ہیں، چنانچہ ہم ان پر عمل کرتے ہیں۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے بارے میں ہمیں کتاب و سنت میں کوئی واضح ہدایت نہیں ملتی تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ائمۂ سلف نے اس کے بارے میں کیا اجتہادات فرمائے ہیں۔ ان کے اجتہادات میں سے جس کے قول کو کتاب و سنت سے سب سے زیادہ لگتا ہوا پاتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اگر معاملہ ایسا ہے جو ائمہ کے زمانے میں پیش نہیں آیا ہے یا اس کے بارے میں ان کی رائیں ہم تک نہیں پہنچی ہیں تو ہم خود اس پر غور کرتے ہیں کہ کتاب و سنت سے لگتی ہوئی بات اس کے بارے میں کیا ہو سکتی ہے اور جس طرف ہماری تحقیق ہم کو لے جاتی ہے ہم اس کو عمل کے لئے اختیار کر لیتے ہیں۔ ہماری تحقیق غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی۔ لیکن ہم دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ سے اجر کے امیدوار ہیں اس لئے کہ ہماری ذمہ داری صرف اسی قدر ہے کہ جن امور کے بارے میں خدا اور اس کے رسول کی کوئی واضح ہدایت نہ موجود ہو اور نہ ان کے بارے میں ہم سے بہتر لوگوں کے اجتہادات نے ہی کوئی رہنمائی کی ہو ان کے بارے میں ہم اپنی استعداد و استطاعت کی حد تک خدا کی مرضی سے اوفق بات معلوم کرنے کی کوشش کریں اور جس بات پر ہمارا دل ٹھک جائے کہ یہ بات خدا کی شریعت سے اوفق ہے اس کو اختیار کر لیں۔ ہم خلوص نیت کے ساتھ جو بات اختیار کر لیں گے وہی بات ہمارے لئے موجب اجر بن جائے گی خواہ

وہ فی الحقیقت غلط ہو یا صحیح۔ ہم اس بات کو کسی حالت میں جائز نہیں سمجھتے کہ جس بارے میں ہمیں خدا اور رسول کی کوئی واضح ہدایت نہ ملے تو ہم شریعت سے اوفق کی جستجو کئے بغیر باطل ہی کی پیروی کر ڈالیں، یا اگر اہل تر حضرات مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے آنا چھوڑ دیں تو ہم بھی نماز پڑھانے سے انکار کر دیں۔ ہم ایسی خاکساری کے قائل نہیں ہیں جو ادائے فرائض میں مانع ہو۔

اب صرف دو باتیں اس سلسلے میں قابلِ غور رہ جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ کیا ہم نے کوئی اجتہاد ایسا کیا ہے جو ائمہ اربعہ یا ان کے اکابر منتسبین کے اجتہاد کے خلاف ہے اور ہم نے ان سب کو چھوڑ کر اپنی کوئی الگ راہ نکالی ہے؟ دوسری یہ کہ کیا ہم نے اپنے سے بہتر اہلِ علم کو نظر انداز کر کے خود مسندِ اجتہاد سنبھال لینے کی کوشش کی ہے؟ میں ان دونوں باتوں کو بھی یہاں صاف کر دینا چاہتا ہوں۔

اگرچہ اس بات کی کوئی دلیل حصر موجود نہیں ہے کہ فقہ کو ائمہ اربعہ ہی کے اندر دائر و سائر رکھنا چاہیے اور اس دائرے سے الگ ہو کر دین میں کسی اجتہاد کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ شاہ صاحب کے جس قول کا صاحب تحریر بزرگ نے حوالہ دیا ہے وہ بھی محض ان کا ذوق ہے، اس کی کوئی شرعی یا عقلی دلیل انھوں نے نہیں دی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب کا مسلک اس بارے میں وہی ہے جو صاحب تحریر بزرگ نے شاہ صاحب کا بیان فرمایا ہے۔ وہ ائمہ اربعہ کے مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو بربنائے دلائل ترجیح تو دیتے ہیں لیکن اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے اجتہادات کو نظر انداز کر کے کوئی اجتہاد کیا جائے۔ میں نے یہ بات متعدد بار ان کی تقریروں میں سنی ہے۔ اس وقت یہ نہیں عرض کر سکتا کہ انھوں نے یہ بات کہیں لکھی بھی ہے یا نہیں۔ بہرحال وہ صاحب علم کے لئے کسی ایک فقہ کے تقلید کو تو صحیح نہیں سمجھتے لیکن مذاہبِ اربعہ کے تقید کو جہاں تک میں سمجھتا ہوں بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اصولاً ہر مذہب کے صرف ان متقدمین کو لائق اعتنا سمجھتے ہیں جو خود مجتہد تھے اور ان متاخرین کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے جو لوگوں کے نرے مقلد تھے۔ مجھے ان کے

کسی ایسے اجتہاد کا پتہ نہیں جس میں انھوں نے ائمۂ اربعہ کو چھوڑ کر تفرد اختیار کیا ہو۔ اگر صاحبِ تحریر بزرگ اُن کے کسی ایسے اجتہاد سے واقف ہوں تو اس سے ضرور آگاہ فرمائیں۔

رہی دوسری بات کہ ہم نے اپنے سے بہتر اہلِ علم کو نظر انداز کیا ہے تو یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اول تو اس ملک میں ایسے اہلِ علم ہیں ہی کتنے جو اجتماعی اور سیاسی مسائل میں دین کا نقطۂ نظر سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اور اگر کچھ لوگ ایسے ہیں بھی تو ابھی وہ ہم سے اس بات پر لڑ رہے ہیں کہ دین کا اجتماعی اور سیاسی زندگی سے کوئی علاقہ ہے بھی یا نہیں؟ حد یہ ہے کہ ہمارے ملک کے مغرب زدہ لیڈروں تک نے یہ تسلیم کر لیا کہ ہمارا دین جس طرح ہماری انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے اس طرح ہماری سیاسی زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ابھی ہمارے بزرگانِ دین کے دل کی کھٹک پوری طرح نہیں نکلی ہے۔ ایسی صورت میں جبکہ ہمارے اور ان کے درمیان اصل مسئلہ ہی مابہ النزاع ہے اور اس پر وہ ہم سے لڑ رہے ہیں کہ دین کو ان چیزوں سے کوئی تعلق بھی ہے یا نہیں جن چیزوں سے ہم اس کا تعلق جوڑ رہے ہیں تو ہمارے لئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ عرض کر سکیں کہ ہمارے سامنے یہ یہ مشکلات ہیں، ان میں ہماری رہنمائی فرمائیے۔ اس لئے مجبوراً ہمیں اپنا کام خود ہی سنبھالنا پڑا ہے لیکن ہم یقین دلاتے ہیں کہ جس دن ہم یہ محسوس کر لیں گے کہ ہمارے اور ان کے نقطۂ نظر میں کوئی بنیادی فرق باقی نہیں رہا ہے تو ہم سے زیادہ کسی کو اس بات میں خوشی نہیں ہوگی کہ ہم ان کی رہنمائی سے مستفید ہوں۔

بہرحال ہم نے اجتہاد کے کام کو کوئی فخر اور لذت کا کام کبھی نہیں سمجھا ہے۔ اور نہ کبھی اُس دائرے کے اندر ہم نے کوئی اجتہاد کیا ہے جس دائرے کے اندر ہم سے بہتر لوگ اس فرض کو انجام دے چکے ہیں۔ ہم نے اس کام کو ایک ناگزیر دینی ضرورت کی حیثیت سے انجام دیا ہے اور صرف اس حد تک اس کی ذمہ داری اٹھائی ہے جس حد تک شریعت کے ساتھ اپنی زندگی کا ربط قائم رکھنے کے لئے ہم اس کے محتاج تھے۔

(۵) ایک الزام صاحبِ تحریر بزرگ نے تنقید میں بے اعتدالی کا بھی لگایا ہے۔ موصوف کا خیال ہے کہ مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں کو تنقید کا چسکا پڑ گیا ہے اور وہ اس کام کو محض لذتِ نفس کے لئے کرتے ہیں اور چونکہ لذتِ نفس کے لئے کرتے ہیں اس لئے لازمی طور پر اس میں غیر معتدل بھی ہو گئے ہیں۔

یہ بات واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ لذتِ نفس اور تسکینِ ذوق کے لئے اس زمانے میں مشاغل کی کمی نہیں ہے کہ ہم اس کے لئے یہ راہ ڈھونڈتے۔ ہمارا کوئی کام بھی محض ایک مشغلہ کے طور پر نہیں ہوتا۔ اور نہ ہم کبھی مضمون نگاری محض مضمون نگاری کی خاطر کرتے ہیں۔ ہماری تمام تحریری اور تقریری سرگرمیوں کا محور وہ دعوت ہے جو ہم اقامتِ دین کے لئے دے رہے ہیں۔ جب تک کسی چیز کا اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہ ہو وہ ہمارے ہاں زیرِ بحث نہیں آتی۔ اور تنقید کے لئے تو ہم کبھی اس وقت تک قلم اٹھاتے ہی نہیں جب تک کسی چیز کی نسبت ہم یہ نہ محسوس کر لیں کہ یہ چیز دعوتِ دین کی راہ میں مزاحم ہو رہی ہے۔ تصوف پر ہمارے ہاں جو کچھ بھی لکھا گیا ہے اسی پہلو سے لکھا گیا ہے۔ ہم نے خود پیش قدمی کر کے کبھی اس سے تعرض کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ہمارے سامنے بار بار یہ بات بڑے اصرار کے ساتھ لائی گئی کہ اصلاح و تزکیہ اور تجدید دین کا اصلی راستہ وہ ہے جو اربابِ تصوف نے اختیار فرمایا۔ ہم نے ایمانداری کے ساتھ اس رائے کو غلط سمجھا اس لئے ہم نے اپنا یہ فرض جانا کہ جو کچھ ہمارے نزدیک صحیح ہے ہم اس کو بیان کر دیں، تاکہ ہمارا موقف لوگوں کے سامنے اچھی طرح واضح ہو جائے۔ اب اگر آپ حضرات یہ فرماتے ہیں کہ "یہ احوال و کوائف اور اسرار و مواجید ہیں جن پر تنقید کی ضرورت اور نہ رائے زنی کی حاجت"، یا "عشاق کے یہ صحیفے صرف لپیٹ کر رکھ دینے کی چیزیں ہیں نہ انکار می کنم و ایں کار می کنم کا معاملہ ان کے ساتھ مناسب ہے" یا "یہ خلوت کے انفرادی احوال جلوت کے اسٹیج پر افشا کے لئے نہیں ہوتے۔" تو کس نے آپ حضرات سے یہ کہا تھا کہ یہ خلوت کے اسرار جلوت کے اسٹیج پر بیان فرمائیے اور عشاق کے ان صحیفوں کی منظرِ عام پر نمائش کیجئے؟ یقیناً

اس پردہ دری کے مجرم ہم نہیں ہیں بلکہ آپ ہی حضرات ہیں۔ جب آپ ان کو منظرِ عام پر لا چکے تو یہ کہنے کے کیا معنی کہ ان کو صرف وہی پڑھیں جو جوہر شناس ہیں اس لئے کہ ان کے اندر اسرار بند ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کہنے کے معنی اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں کہ جن کی توجہ ان کی طرف نہ بھی ہونے والی ہو وہ بھی اس نقاب کو الٹنے کے مشتاق اور آرزومند ہو جائیں۔

جب آپ ایک کتاب لکھتے ہیں اور پریس اس کو چھاپ بھی دیتا ہے تو اس کو اہل اور نااہل بھی پڑھیں گے۔ آپ کے اس کہہ دینے کی وجہ سے کہ نااہل اس کو نہ پڑھیں یہ نہیں ہوگا کہ نااہل لوگ اپنی نااہلیت کو ٹھیک ٹھیک جان کر اس کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیں گے بلکہ انسانی فطرت کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس ممانعت کے بعد نااہلوں میں اس کی مانگ اور بڑھ جائے گی اور پریس بھی اس کے چھاپنے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اگر اس کتاب کے سبب سے لوگوں میں کوئی فتنہ پھیلے گا تو اس کی ذمہ داری سے وہ لوگ عنداللہ بری نہیں ہو سکتے جو ایسی "پُراسرار" کتابوں کے شائع کرنے والے بنے۔ پھر انھوں نے یہ غضب بھی کیا کہ لوگوں کے ذوقِ جستجو کو شہ دینے کے لیے ان کتابوں پر یہ کتبہ بھی لگا دیا کہ ان کو صرف وہی پڑھیں جو اہل ہیں۔ اور اہل بھی کیسے معمولی اہل نہیں، کیونکہ ان کتابوں کے اسرار اور رموز سمجھنے کے لئے مودودی صاحب اور ان کے رفقاء تو درکنار ابن تیمیہ اور ابن قیم جیسے لوگ بھی ان حضرات کے نزدیک نااہل ہی سمجھے جاتے ہیں اور ان کی نسبت بڑے طنطنہ کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ "ارباب ظاہر اور اصحاب عقولِ محض ان باتوں کو کیا جانیں۔"

اس علمِ باطن کے ثبوت میں صاحب تحریر بزرگ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کے اقوال کے اجمالاً حوالے دیئے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے کس قول کی طرف موصوف نے اشارہ فرمایا ہے، اس کے اصل الفاظ کیا ہیں اور سند کے اعتبار سے اس کا حال کیا ہے؟ البتہ حضرت ابوہریرہؓ کے جس قول کا موصوف نے حوالہ دیا ہے اس کی

گزریں گی، بہت سے لوگوں کے ایمان تک متزلزل ہو جائیں گے۔ آخر حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے کی تاریخ اور بعد کے فتنوں کے حالات آپ کہاں لے جا کر دفن کریں گے کہ کسی کی ان پر نظر نہ پڑنے پائے؟

مودودی صاحب سے صاحبِ تحریر بزرگ کو یہ بھی شکایت ہے کہ انھوں نے امام غزالی کو حدیث میں کمزور ٹھیرایا ہے اور امام مہدی کی علامات کے سلسلہ میں جو احادیث وارد ہیں ان کا انکار کیا ہے۔

میں صاحبِ تحریر بزرگ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں جرموں میں سے کسی جرم میں بھی مودودی صاحب منفرد نہیں ہیں۔ ناقدینِ حدیث نے خود ہی ان دونوں جرموں میں پہل کر کے دوسروں کے لئے راہ کھول دی ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں بکثرت کمزور حدیثیں نقل کی ہیں جن کی ناقدین حدیث نے نشان دہی کی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو امام صاحب نے عام صوفیہ کے طریقے پر پند و موعظت کے سلسلے کی حدیثوں میں محدثانہ چھان بین کو ضروری ہی نہ خیال کیا ہو، یا یہ بات ہو کہ فلسفہ و تصوف کی دلچسپیوں نے ان کو حدیث کی تحقیق و تنقید کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیا ہو۔ بہر حال احیاء العلوم میں بکثرت کمزور حدیثیں موجود ہیں اور اس معاملے میں ذوق کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ نقدِ حدیث کے تلے بندھے اصول ہیں۔ اگر صاحبِ تحریر بزرگ ان اصولوں سے واقف ہیں تو خود بھی وہ احیاء کی حدیثوں کو تول کے دیکھ سکتے ہیں کہ وہ محدثانہ اصولوں پر پوری اترتی ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد اگر امام صاحب کے ساتھ ان کے اندر حدیث کی حفاظت و صیانت کے لئے بھی کوئی حمیت ہوگی تو وہ بھی وہی کہیں گے جو مودودی صاحب نے کہا ہے۔ فن کے معاملے میں ذوق اور تکلفانہ احترام کوئی چیز نہیں ہے۔ ناقدین حدیث اس معاملے میں کسی کو بھی نہیں بخشتے۔

مہدی کی علامات سے متعلق جو روایتیں وارد ہیں ان کے درجے اور ان کی نوعیت سے متعلق اگر کوئی اور چیز میسر نہ آئے تو صاحبِ تحریر بزرگ ابنِ خلدون کے مقدمے ہی کی بعض

مودودی صاحب نے ان لوگوں کو شہ دی ہے جو پہلے ہی سے صحابہ و محدثین کی تحقیر کے درپے تھے۔

مودودی صاحب نے یہ ساری باتیں اپنے جی سے نہیں گھڑی ہیں بلکہ سیر و رجال اور دین کی معتبر کتابوں سے ہی لی ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب العلم میں اس طرح کی بہت سی چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ محدثین ان معاملات میں اتنے نازک مزاج نہیں تھے جتنے ہمارے صاحبِ تحریر بزرگ ہیں، ورنہ جرح و تعدیل کا وہ فن وجود ہی میں نہ آتا جس پر مسلمان ناز کرتے ہیں۔

رہی یہ بات کہ مودودی صاحب نے ان باتوں کا ذکر کس لئے کیا ہے؟ صحابہ اور محدثین کی تضحیک کے لئے یا جرح و تعدیل کے صحیح نقطۂ اعتدال کو نمایاں کرنے کے لئے؟ تو اس کا اندازہ ہر شخص مضمون کا مطالعہ کر کے خود کر سکتا ہے۔ یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ اگر مودودی صاحب اپنے مضمون میں ان باتوں کا ذکر نہ کرتے تو یہ ساری باتیں راز ہی پڑی رہتیں۔ کوئی ان کا جاننے والا دنیا میں نہ تھا۔ حالانکہ صاحبِ تحریر بزرگ ممکن ہے ان باتوں سے بے خبر رہے ہوں، لیکن اس زمانے میں یہ ساری باتیں اکثر پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں اور منکرینِ حدیث انھی باتوں کو اچھال اچھال کر اُن کو یہ ثابت کرنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں کہ پورے ذخیرۂ حدیث ہی کو دریا برد کر دینا چاہیے۔ ان حالات میں شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے کی پالیسی محض ایک احمقانہ پالیسی ہے۔ صحیح طریقہ اب صرف یہ ہے کہ اس طرح کی باتوں کے صحیح موقع و محل کو واضح کر دیا جائے اور ان سے نقدِ حدیث اور جرح و تعدیل کے سلسلے میں جو ٹھیک نتائج نکلتے ہیں، ان کو سامنے رکھ دیا جائے تاکہ اگر کوئی شخص ان باتوں پر سے گزرے تو کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ علاوہ ازیں ہمیں اپنے بزرگ اسلاف کو معصوم فرشتے بنا کے بھی دکھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بشری کمزوریوں کو رکھتے ہوئے جتنے کچھ ہیں دنیا کے سامنے ان کو اسی شکل میں پیش ہونا چاہیے۔ ان کی یہ شکل بھی اتنی خوبصورت ہے کہ دنیا کو موہ لینے کے لئے کافی ہے۔ البتہ اگر ہم نے لوگوں کو انھیں بناوٹی شکل میں دیکھنے کا عادی بنا دیا تو اس سے اندیشہ ہے کہ جب کبھی تاریخ و سیر اور رجال کی کتابوں میں ان کے متعلق کچھ ناگوار باتیں لوگوں کی نگاہ سے

بحثوں پر نگاہ ڈالی ہیں۔ اس نے تمام روایات کی حیثیت کو واضح کر دیا ہے۔ علامات مہدی میں سے جن جن کو مودودی صاحب نے ناقابل اعتبار ٹھیرایا ہے ان میں سے ہر ایک کے ناقابل اعتبار ہونے کی دلیل بھی بیان کر دی ہے۔ آپ ان پر شور مچانے کے بجائے ان دلائل پر تنقید فرمائیں۔

(۶) چھٹا الزام یہ ہے کہ مولانا مودودی کو جماعت اسلامی کے لوگ مجدد سمجھنے لگے ہیں۔ حیرت ہے کہ صاحب تحریر بزرگ نے صرف مجدد سمجھے جانے ہی کا الزام لگایا ہے، ورنہ الزام تو بعض حلقوں سے دعوائے مہدویت بلکہ نبوت تک کے لگنے لگ چکے ہیں۔

اس معاملے میں لوگ عجیب افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ اگر معاملہ اپنے حلقے کے کسی عالم یا شیخ طریقت کا ہو تو اس کو بے تکلف مجدد شریعت و طریقت بنا کے رکھ دیں گے، لیکن اگر معاملہ اپنے حلقۂ خاص سے باہر کے کسی شخص کا ہو تو اس کا کوئی قدرداں جیسے کتنے ہی ہلکے الفاظ میں اس کی دینی خدمات کی تحسین کرے، ان حضرات کے دل پر اس کی سخت چوٹ پڑتی ہے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی گنجائشیں نکالنے لگتے ہیں کہ اس پر اور اس کے قدردانوں پر کوئی الزام چسپاں کیا جا سکے، تاکہ اور کچھ نہیں تو بدنام ہی کر کے دل ٹھنڈا کر لیا جائے۔ کہیں اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ یہ حضرات دین اور دینی معاملات کو اپنا اجارہ سمجھتے ہیں اور یہاں کسی اور کا بزعم خود دیکھنا ان کے لئے ناقابل برداشت ہے؟

تجدید اور مجدد کے معاملے میں میرا نقطۂ نگاہ اوروں کے نقطۂ نگاہ سے بالکل مختلف ہے۔ اس امت میں چونکہ کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، نبوت کا منصب آنحضرت صلعم پر ختم ہو چکا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے اندر شریعت کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دینے کے واسطے دو خاص انتظام فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی تحریفوں سے ہمیشہ کے لئے مامون کر دیا۔ اگلی امتوں کے صحیفوں میں جس طرح کی تحریفات واقع ہو گئیں اور جس کے سبب سے وہ نئے نبیوں کی بعثت کی محتاج ہوئیں وہ بات اس امت کو نہیں پیش آئے گی۔ دوسرا یہ کہ اس امت میں ایسا فساد کبھی نہیں واقع ہو گا کہ اس کے

اندر حق کی حامل کوئی جماعت سرے سے باقی ہی نہ رہ جائے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن مجید میں اشارات موجود ہیں اور آنحضرت صلعم نے بھی نہایت واضح الفاظ میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ اسلام غربت (اجنبیت اور بیکسی) کی حالت میں شروع ہوا اور پھر یہی حالت اس پر لوٹ آئے گی، مبارک ہیں وہ جو اجنبی سمجھے جائیں کیونکہ وہ لوگوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کریں گے۔ ایک دوسری روایت میں یہ مضمون ہے کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور حق کے مخالفین اس کو اقامتِ حق کے کام سے روک نہ سکیں گے (او کما قال)۔ اسی طرح ایک اور روایت میں ہے کہ جب اس امت میں اس طرح فساد سرایت کر جائے گا جس طرح اس شخص کے جسم میں زہر سرایت کر جاتا ہے جس کو باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہو تب بھی اللہ تعالیٰ اس امت کے ایک عضو کو فساد سے محفوظ رکھے گا۔

یہ تمام حدیثیں اس بات پر شاہد ہیں کہ اس امت کے اندر مصلحین و مجددین اور دین حق پر قائم رہنے والوں اور لوگوں کے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کرنے والوں کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہے گا۔ مجددین اور مصلحین کا یہی گروہ ہے جس کا ذکر "من یجدد لها دینها" والی حدیث میں آیا ہے لیکن چونکہ اس حدیث میں "مائۃ" کا لفظ آیا ہے جو دور اور صدی دونوں معنوں کے لئے آتا ہے نیز "من" کا لفظ آیا ہے جو واحد اور جمع دونوں کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اس لئے عموماً لوگوں کو اس کا مطلب سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی۔ اکثر لوگوں نے "مائۃ" کو صدی کے معنی میں اور "من" کو واحد کے مفہوم میں لیا اور یہ سمجھے کہ ہر صدی میں اللہ تعالیٰ کسی خاص شخص کو بھیجا کرتا ہے جو اس صدی کا مجدد ہوا کرتا ہے حالانکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر دور میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہتا ہے جو اس دور میں خدا کے دین کو تازہ کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ بعینہ اس مضمون کا دوسرے الفاظ میں اعادہ ہے جو اوپر کی حدیثوں میں گزر چکا ہے۔ نہ اس سے کچھ مختلف ہے اور نہ اس مضمون پر ایک حرف کا اضافہ ہے۔ لیکن لوگ "مائۃ" اور "من" دو لفظوں کا صحیح مفہوم سمجھنے میں غلطی کر جانے کی وجہ سے خواہ مخواہ کے تکلفات میں پڑ گئے۔ قطع نظر اس کے کہ

اس غلط مطلب نے بہت سے کمزور نفوس کے اندر وسوسہ اندازی کی اور وہ مجددیت کے خواب دیکھنے لگے، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ لوگوں نے ہر صدی کے آغاز و اختتام پر ایک مجدد کی تلاش شروع کر دی۔ اور اگر کوئی اہل آدمی نہ مل سکا تو اس حدیث کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کسی نا اہل ہی کو اس مسند پر لا بٹھایا کہ بہر حال جگہ خالی نہیں رہنی چاہیے۔[1]

میرے نزدیک مجدد والی حدیث کا مفہوم وہی ہے جو دوسری حدیثوں میں بیان ہوا ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہر دور میں مصلحین و مجددین کی ایک جماعت کو برپا رکھے گا جو اللہ کے دین پر خود بھی قائم رہے گی اور دوسروں کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کرتی رہے گی۔ اس جماعت کی خاص پہچان یہ ہوگی کہ رسول اور صحابہ کے طریق پر گامزن رہے گی اور اقلیت میں ہونے کے باوجود باطل سے کشمکش کرتی رہے گی۔

جہاں تک اس مسئلے کی اصولی حیثیت کا تعلق ہے اس کے بارے میں میرا نقطۂ نگاہ یہ ہے۔ باقی رہا خاص مودودی صاحب کا معاملہ تو میں اُن کو اس سے اونچا سمجھتا ہوں کہ وہ اس قسم کے کسی وسوسے میں مبتلا ہوں۔ وہ ایک دانشمند اور خدا ترس آدمی ہیں اور راہِ حق کی آزمائشوں اور صعوبتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھے امید نہیں ہے کہ وہ خدا کے ہاں پہنچنے

---

[1] بعینہٖ یہی بات مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے۔ ان سے پوچھا گیا: ہر صدی میں مجدد کا مبعوث ہونا ثابت ہے، اس صدی کا مجدد کون ہے؟ جواب میں فرمایا: "ہر وقت میں جو علماء قامع بدعت اور حامی سنت ہوں اُن کا مجموعہ مراد ہے۔ جو شخص بایں طرح ہو اُس مجموعے کا ایک جزء خیال کرنا چاہیے۔ اور جن لوگوں نے ایک کو قرار دیا ہے اُن کو سخت مصیبت پیش آئی۔ ہر چند تاویلات کی گئیں تاہم درست نہیں ہوا" (فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم۔ ص ۵۲)

سے پہلے ہی اپنے مرتبے اور درجے کا فیصلہ کرنے کی جسارت کریں گے۔ [^۱] جماعت کے اندر اگر کچھ لوگ ایسے ہیں جو ان کو مجدد خیال کرتے ہیں تو میں ان کو بھی یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اس فیصلے میں جلدی نہ کریں۔ جب تک ایک شخص زندہ ہے وہ فتنوں سے مامون نہیں ہو سکتا۔ کیا خبر جس شخص کو آپ آج اس صدی کا مجدد ثابت کرتے ہیں کل کو وہ کس کیمپ میں ہو اور آپ کس کیمپ میں ہوں۔ پھر جو باتیں خدا کے فیصلہ کرنے کی ہیں آپ ان کا فیصلہ کرنے والے کون؟ کسی شخص کے مجدد ہونے کے لیے تنہا یہی بات تو کافی نہیں ہے کہ اس نے آپ کے نقطۂ نظر سے تجدید و اصلاح کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کا خلوص اور اس کی نیک نیتی بھی تو مطلوب ہے جس کا فیصلہ بہرحال ہم اور آپ نہیں کر سکتے بلکہ خدائے علام الغیوب ہی کر سکتا ہے۔

(۷) آخری الزام جو صاحب تحریر بزرگ نے مولانا مودودی اور ان کے رفقاء پر لگایا ہے وہ فوٹو کھنچوانے کا ہے۔ یہ الزام بالکل ہی بے بنیاد ہے۔ جیل سے رہائی کے بعد مولانا

---

[^۱]: اُن کا اپنا بیان اس سلسلے میں یہ ہے جو اب سے کئی سال پہلے "ترجمان القرآن" میں شائع ہو چکا ہے:

"اس قسم کے شبہات کا اظہار کرنا کسی ایسے آدمی کا کام تو نہیں ہو سکتا جو خدا سے ڈرتا ہو، جسے خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کا احساس ہو، اور جس کو اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت بھی یاد ہو کہ اجتنبوا کثیرا من الظن ان بعض الظن اثم۔ جو حضرات اس قسم کے شبہات کا اظہار کر کے بندگانِ خدا کو جماعت اسلامی کی دعوتِ حق سے روکنے کی کوشش فرما رہے ہیں، میں نے ان کو ایک ایسی خطرناک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جس سے وہ کسی طرح رہائی حاصل نہ کر سکیں گے، اور وہ سزا یہ ہے کہ ان شاء اللہ میں ہر قسم کے دعووں سے اپنا دامن بچائے ہوئے اپنے خدا کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا اور پھر دیکھوں گا کہ یہ حضرات خدا کے سامنے اپنے ان شبہات کی، اور ان کو بیان کر کر کے لوگوں کو حق سے روکنے کی کیا صفائی پیش کرتے ہیں۔"

(ترجمان القرآن۔ بابت ماہ رجب ۱۳۶۵ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۶ء)

مودودی کے ایک دو فوٹو بعض اخباروں میں ضرور چھپے ہیں لیکن ان کے کھینچے جانے یا ان کے شائع ہونے میں مولانا کی مرضی یا ان کے علم کو کوئی دخل نہیں ہے۔ کھینچنے والوں نے کھینچا اور چھاپنے والوں نے چھاپا۔ اس کے عذاب و ثواب کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ مولانا مودودی اخلاقی اعتبار سے اتنے بودے نہیں ہیں کہ ایک طرف تو تصویر کھنچوانے اور اس کے شائع کرانے کی حرمت کا فتویٰ دیں دوسری طرف اپنے ساتھیوں کو لے کر فوٹو کھنچوانے کھڑے ہو جائیں۔ صاحب تحریر بزرگ سے گزارش ہے کہ وہ اپنے حلقے کے لوگوں کے بارے میں حسنِ حُسنِ ظن سے کام لینے کے عادی ہیں اگر اس کے دسویں حصہ حسنِ ظن سے بھی اس معاملے میں کام لیتے تو ایک مسلمان کے متعلق وہ اس بدگمانی میں نہ مبتلا ہوتے لیکن یہ عجیب دردانگیز صورتِ حال ہے کہ جہاں معاملہ اپنے حلقے سے باہر والوں کا ہوتا ہے وہاں تو یہ حضرات مچھر کو بھی چھاننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر معاملہ اپنوں کا ہو تو اونٹ تک نگل جائیں گے۔[1]

جواب تتمہ

صاحبِ تحریر بزرگ نے اپنے مضمون کے اس ٹکڑے کو "روحِ مضمون" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے ہمارے نزدیک بھی اس ٹکڑے کی حیثیت فی الواقع یہی ہے۔ ان کے طویل طویل مضمون سے بھی ان کا باطن اتنی خوبی کے ساتھ ہمارے سامنے بے نقاب نہیں ہو سکا تھا جتنی خوبی کے ساتھ ان کی ان چند سطروں میں وہ بے نقاب ہو گیا ہے۔ وہ ان سطروں میں اپنا باطن ہی بے نقاب کرنے پر مجبور نہیں ہو گئے ہیں بلکہ انھوں نے ہماری دعوت کا وہ باب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے جو اتنے نمایاں طور پر ہمارے سامنے یا تو آیا ہی نہیں تھا یا آیا تھا تو ہم نے اس کو اچھی طرح پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

مولانا صاحب نے اپنے مخصوص عالمانہ انداز بیان میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ مقبولِ خدا ہوتے ہیں ان کی مقبولیت کا آغاز خواص سے ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ

[1] مولانا عبید اللہ سندھی کی مثال آخر کس سے چھپی ہوئی ہے۔

وہ پہلے عوام کالانعام میں مقبول ہوں اور اس کے بعد خواص ان کی طرف متوجہ ہوں۔ اس اصول کو قائم کرنے کے بعد وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مودودی صاحب کوئی مقبولِ خدا آدمی ہرگز نہیں ہو سکتے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اقامتِ دین کے نام سے جو دعوت شروع کر رکھی ہے اس میں صرف ان لوگوں نے ان کا ساتھ دیا ہے "جو کل تک یا رائے سے کورے تھے یا یقین سے کورے، علم و فکر سے عاری تھے یا تقویٰ و ورع سے فارغ، ختمِ نبوت میں مذبذب تھے یا خاکساریت کے علمبردار، نیچریت سے مسموم تھے یا الحاد کے شکار، وہی متوجہ ہو رہے ہیں۔ اہلِ علم و تقویٰ گویا روشناس ہی نہیں۔ یا مدارسِ عربیہ کے چند نئے نئے فارغ شدہ جو زمانۂ تحصیل میں بھی بغاوت اور کمیونزم بکف تھے[۱]۔"

مولانا صاحب کی یہ سطریں پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو کس طرح دہراتی ہے اور دعوتِ دین کا ہر دور ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ واقع ہوا ہے!

جو طعنے آج مولانا صاحب جماعت اسلامی کے خادموں کو سنا رہے ہیں بعینہٖ یہی طعنے کم و بیش انھی الفاظ میں اُن لوگوں کو سنائے گئے تھے جنھوں نے اگلے زمانوں میں نبیوں اور رسولوں کا ساتھ دیا تھا۔ اور یہ طعنے دینے والے اپنی نسبت بعینہٖ وہی رائے بھی رکھتے تھے جو مولانا صاحب اپنی نسبت اور اپنے زمرے کے دوسرے بزرگوں کی نسبت رکھتے ہیں۔ حضرت نوح، حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہم السلام کے زمانوں میں جن لوگوں نے دعوتِ حق کا ساتھ دیا ان کو ان کے زمانے کے "اکابر" کی زبان سے یہ طعنہ سننا پڑا کہ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ "حقیر اور رائے سے کورے ہیں"۔ "حضرت مسیح علیہ السلام نے جب دعوتِ حق بلند کی تو وہ تمام علمائے یہود جو "علم و عمل، فکر و اخلاص، تجربہ و تدین، رائے اور یقین کے اعتبار سے عظیم القدر" ہونے کے مدعی تھے "وہ بالکل غیر متوجہ رہے" اور جن چند غریبوں نے ان کا ساتھ دیا ان کو ان "اہلِ علم و تقویٰ" حضرات نے سُفہاء یعنی جاہل اور علم و فکر سے عاری قرار دیا اس لئے کہ وہ غریب مشیخت کی گدیوں اور درس و افتا کی مسندوں سے ناآشنا، دریا کے کنارے کے ماہی گیر تھے۔ اسی طرح ان غریبوں کو

[۱] ہمیں نہیں معلوم کہ جماعت میں شامل ہونے والے کون کون دیوبندی حضرات کا یہ حال رہا ہے۔

تقویٰ اور تورع سے فارغ" بھی قرار دیا گیا اس لیے کہ علماء حضرات کو ان سے یہ شکایت تھی کہ یہ کبھی کبھی ہاتھ دھوئے بغیر ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ انھی بزرگوں کے جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا کہ "کتنے ہیں جو آگے تھے وہ پیچھے ہو جائیں گے اور کتنے ہیں جو پیچھے تھے وہ آگے ہو جائیں گے"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دعوتِ حق بلند کی تو مکہ اور طائف کے تمام اکابر جو صاحب الرائے سمجھے جاتے تھے اور قریش کے تمام صنادید جو بیت اللہ کی مختلف گدیاں سنبھالے ہوئے تھے بالکل "غیر متوجہ رہے" اور صاف الفاظ میں انھوں نے کہا کہ کچھ سرپھرے چھوکروں اور کچھ غلاموں نے یہ سارا ہنگامہ اٹھا رکھا ہے، بزرگوں میں سے کوئی اس فتنے میں شریک نہیں ہے۔ یہود کے علماء نے بھی آگے بڑھ کر انھی لوگوں کی تائید کی اور کہا کہ یہ کچھ سفہا یعنی "فکر و رائے سے عاری" لوگ ہیں جو محمد کا ساتھ دے رہے ہیں۔

اگرچہ ہمارے حقیر کام کو انبیاء علیہم السلام کے عظیم کام سے وہی نسبت ہے جو ذرے کو آفتاب سے ہوتی ہے، اور ہماری شخصیتوں کا تو ان سے کوئی مقابلہ ہی نہیں، لیکن دونوں کے مخالفین کے لب ولہجے کی اس یکسانی اور ان کی ذہنیت کی اس مشابہت کو دیکھ کر کبھی کبھی دل میں یہ خیال گزرتا ہے کہ ع گرچہ خوردیم نسبتیست بزرگ۔

اصل یہ ہے کہ آدمی جب تک حق کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسولوں کے طریقے سے پہچاننے کے بجائے اشخاص و افراد کے ذریعے سے پہچاننے کی کوشش کرے گا اس پر حق کی راہ کبھی کھل ہی نہیں سکتی۔ اس ذہنیت کے لوگ اپنے آگے چلنے والوں کے پیچھے چلتے ہیں اور اپنی سادہ لوحی سے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح وہ کسی کے پیچھے آنکھ بند کر کے لگ گئے ہیں اسی طرح حق بھی دست بستہ ان کے پیچھے پیچھے لگ گیا ہے اور ممکن نہیں ہے کہ ان کی پیروی کے سوا حق کو پانے کا کوئی اور ذریعہ مل سکے۔ اسی ذہنیت کے لوگوں نے مسیح کے زمانے میں علمائے یہود کا ساتھ دیا اس لیے کہ بہرحال "خواص" کی حیثیت یروشلم کے ان پشتینی دینداروں ہی کو حاصل تھی نہ کہ دریا کے کنارے کے ان ماہی گیروں کو جنھوں نے مسیح علیہ السلام کا ساتھ دیا تھا۔ اسی طرح اس زمرے کے لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مکہ اور طائف

کے اکابر کو ساتھ دیا اور مسلمانوں کے مقابلے میں ان کو زیادہ راست رو (اھدیٰ) قرار دیا اس لئے کہ وقت کے خواص اور اصحاب الرائے وہی تھے نہ کہ صہیب و سلمان جو وقت کے اکابر کی نگاہوں میں اراذل بادی الرائے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ہم اس ذہنیت کے لوگوں سے ہمیشہ مایوس رہے ہیں۔ ہم نے اپنی دعوت میں کبھی ان کو پیشِ نظر نہیں رکھا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ لوگ واضح سے واضح حق کو بھی قبول نہیں کرسکتے اگر وہ ان کے پاس ان کے اکابر کے واسطے سے نہ آئے اور غلط سے غلط بات کو بھی اختیار کرلیں گے اگر ان کے اکابر اس کی علمبرداری یا کم از کم تصدیق کردیں گے۔ اس لئے ہم نے اپنا تخاطب براہِ راست اُنھی سے رکھا ہے جو موجودہ سوسائٹی کی قیادت فرما رہے ہیں۔ عام اس سے کہ ان کا تعلق علماء کے طبقے سے ہو یا اہلِ سیاست کے طبقے سے۔

مولانا صاحب نے حدیث کا یہ مطلب تو بالکل ٹھیک سمجھا ہے کہ کسی دعوتِ حق کو سب سے پہلے آگے بڑھ کر قبول کرنے والے ہمیشہ "خواص" ہی ہوتے ہیں لیکن ان خواص کی پہچان کیا ہے؟ کیا یہ کہ وہ کسی دینداری کی موروثی گدیوں کے وارث ہوتے ہیں؟ کیا یہ کہ وہ درس و افتا کی مسندوں پر سرفراز ہوتے ہیں؟ کیا یہ کہ وہ لمبی لمبی عبائیں پہنتے ہیں اور ربی اور عالم کہلانا پسند کرتے ہیں؟ کیا یہ کہ جب وہ بازاروں میں نکلتے ہیں تو لوگ اُن کے ہاتھ پاؤں چومتے ہیں؟ یقیناً مولانا تسلیم کریں گے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کو کسی شخص کے "خواص" میں سے ہونے کی دلیل قرار دیا جاسکے۔ پھر غور کرنا چاہیے کہ خواص کی پہچان ہے کیا؟ حق کے قبول کرنے والے خواص کے اوصاف جہاں تک قرآن و حدیث سے میں سمجھ سکا ہوں، میں نے اپنی کتاب "دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار" میں تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا اس کتاب کا وہ باب ضرور ملاحظہ فرمائیں جو دعوتِ حق کے موافقین اور مخالفین سے متعلق ہے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ سکیں کہ ان خواص کی کیا شناخت ہے جو کسی دعوتِ حق کو قبول کیا کرتے ہیں۔

یہاں تفصیل کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن میں حق کو قبول کرنے والے خواص کے چند اوصاف کا اجمالاً ذکر کروں گا جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔

—— ان کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے گروہی تعصبات اور آبائی تقلیدات سے بالکل آزاد ہوتے ہیں۔

—— اُن کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ اندھی تقلید کی بیماری سے پاک ہوتے ہیں۔ دوسروں کے پیچھے

چلتے ہوئے خود اپنی آنکھیں بھی کھلی رکھتے ہیں۔

——— وہ حق کی کسوٹی صرف اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو مانتے ہیں۔ اشخاص کو حق و باطل کا معیار نہیں بناتے۔

——— اخلاقی اعتبار سے اپنی سوسائٹی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ پست ہمت، ضمیر فروش اور خود غرض نہیں ہوتے اور نہ باطل کا مقابلہ کرنے میں بزدل ہوتے ہیں۔

——— وقت کے نظام باطل سے ان کی وابستگی اگر ہوتی بھی ہے تو خود غرضانہ نہیں ہوتی۔

——— وہ غرور اور گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوتے کہ اپنی ذات اور اپنے حلقے سے باہر کسی خیر کا تصور کر سکیں اور نہ کسی کی رہنمائی قبول کر سکیں۔

یہ علامات ہیں جو قرآن مجید میں ان لوگوں کی بیان کی گئی ہیں جو حق کو قبول کیا کرتے ہیں اور جن کو قرآن حق کے "خواص" میں سے شمار کرتا ہے۔ مولانا صاحب اگر ان کسوٹیوں پر جماعت اسلامی کے ارکان کو جانچیں گے تو مجھے امید ہے کہ وہ ان کو انشاء اللہ موجودہ سوسائٹی کا مکھن ہی پائیں گے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان کے اندر برگزیدہ اور مرشتہ کے افراد شامل ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو انگریزی درس گاہوں کی قتل گاہوں سے بچ کے آئے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو عربی مدرسوں کے قبرستانوں سے نکل کے آئے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو وقت کی مختلف تحریکوں سے متاثر رہے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو مذہبی گروہوں اور حلقوں سے کسی نہ کسی نوعیت سے وابستہ رہے ہیں ——— ہر طرح کے لوگ اس جماعت میں آ آ کے شامل ہوئے ہیں لیکن ان میں سے ہر شخص اپنے اندر وہ خوبیاں ضرور رکھتا ہے جو اوپر بیان ہوئی ہیں اور وہی خوبیاں تھیں جو اس کو اس دعوت کی طرف کھینچ کے لائیں جو اقامت دین کے لیے اس کے سامنے بلند کی گئی۔ آپ حضرات اگر اُن کو سُنہارا اور رازدنیا بادی اثر سے لکھتے ہیں تو شوق سے کہیں۔ ہم اس کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو، دونوں کو حق پہ چلنے والا بنائے اور کبر و غرور کی آفتوں سے محفوظ رکھے۔

———✦———

ہماری اخلاقی صحت کا حال

اور

دعوتِ اصلاح

(نعیم صدیقی)

قرآن نے حیاتِ اجتماعی کے عروج و زوال کا جو فلسفہ ہمیں سکھایا ہے وہ مادہ پرستانہ نظریوں کے خلاف ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ایک قوم کی سرگرمی، جدوجہد، ترقی اور نشوونما ساری کی ساری اصلاً اس کی اخلاقی صحت پر منحصر ہے۔ جب یہ اخلاقی صحت برباد ہو جاتی ہے تو جمود اور زوال کا دور آتا ہے، اور اخلاقی پستی جب انتہا کو پہنچتی ہے تو ایک قوم بالکل ختم ہو کے رہ جاتی ہے۔ ایک اصولِ حق کی شعوری محبت، ایک پاکیزہ نصب العین کی لگن، احساسِ ذمہ داری، نظم و ضبط، دیانت و راست بازی، مساوات و اخوت، توازن و عدل، وحدت و تعاون وغیرہ کی بیش قیمت اخلاقی قدریں کسی انسانی گروہ میں جتنی زیادہ فروغ پاتی ہیں اس کی سرگرمی جدوجہد، اس کی رفتارِ پیدائش دولت، اس کی دفاعی قوت کی ترقی اتنی ہی روز افزوں ہوتی ہے، اور دوسری طرف یہ قدریں جتنی کمزور اور مضمحل ہوتی ہیں معاشی اور دفاعی قوت بھی اتنی ہی کمزور ہوتی چلی جاتی ہے، علم، تہذیب، معاش، دفاع اور بین الاقوامی اثر، پانچوں شعبوں میں حیاتِ اجتماعی کی پیش قدمی کا پورا انحصار اخلاقی قدروں کی مضبوطی پر ہے۔ جس قوم کے اخلاق کو گھن لگ رہا ہو اسے چاہے کتنے اچھے دماغی اور عبقری فراہم کر دیجیے، اس کے خزانوں میں چاہے کتنا ہی سونا چاندی بھر دیجیے، اس کے لئے کیسے ہی شاندار میزانیے بنائیے اور منصوبے بندیاں کیجیے، اس کے لیے کیسے ہی اعلیٰ درجے کے مشینی اسلحہ خرید لائیے، وہ کبھی بھی زندگی کی دوڑ میں آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ایک اخلاق باختہ قوم کا حال بالکل ایک بخار زدہ مریض کا سا ہوتا ہے کہ آپ اسے زرق برق لباس پہنا کر، اس کے بدن پر چمکیلے ہتھیار سجا کر اور

اس کی قوت و عظمت کا پروپیگنڈا کر کے اس کو کسی طرح ایک صحت ور شخص کے برابر نہیں کر سکتے۔ اخلاقی انحطاط اگر اپنا کام کر رہا ہو تو قومی زندگی کے ظاہری پہلو چاہے کتنے ہی شاندار بنا دیے جائیں حقیقی قوت کبھی ہاتھ نہیں آ سکتی۔

ہم ایک ایسی قوم ہیں جو ایک طویل دورِ زوال اور پھر ایک روح فرسا زمانۂ غلامی سے گزر کر اپنے موجودہ مقام تک پہنچی ہے۔ تباہیوں اور خستہ حالیوں کی پیچ در پیچ منازل سے گزرتے ہوئے اس قوم نے اپنے اصول، اپنے مقاصد اور اپنی اخلاقی قدریں ضائع کر دی ہیں۔ یہ اپنے موقف سے اکھڑ چکی ہے، اس کا شیرازہ جس ڈورے سے باندھا گیا تھا وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ چکی ہے، اور اس کے قلعہ کی اینٹوں کی درزوں میں سے جوڑ لگانے والا مسالہ نکل چکا ہے۔

حقائق سے چشم پوشی

ہم جس اخلاقی زوال سے دوچار ہیں اسے اپنی اور دوسروں کی نگاہوں سے چھپانے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں ہم نے اختیار کر رکھی ہیں۔ ہم مریض ہیں لیکن اپنے مرض کا علاج کرنے کے بجائے ہم نے مرض کے اخفا کے مختلف طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ ہم اپنے اخلاقی زخموں پر ریشمی پردے ڈالتے ہوئے ہیں، ہم نے اپنی سیرت کے برص کے داغوں کو برسوں سے ڈھانک رکھا ہے، ہم نے اپنے کیرکٹر کے رستے ہوئے ناسوروں پر نمائش کی پٹیاں باندھ رکھی ہیں، ہم اپنی آہوں کو تبسم میں بدل لینے کے فن میں پختہ مشق ہو چکے ہیں۔ ہم اپنی کراہوں کو نعرہ ہائے تکبیر میں بدلنے کا آرٹ خوب اچھی طرح سیکھ چکے ہیں۔ ہمیں اگر کسی طرف سے اپنے مہلک امراض کا احساس ہونے لگتا ہے تو ایسے موقعوں پر ہم خوش خیالیوں کی افیون گھول کر پی لیتے ہیں اور پھر دنیا و مافیہا سے غافل ہو کر سمجھتے ہیں کہ کوئی خطرہ نہیں ہے۔

عام حالات میں ہماری اخلاقی زندگی کی حالتِ مرض اتنی زیادہ نمایاں نہیں ہوتی کہ ایک عامی کی نگاہ بھی اسے محسوس کر سکے، بلکہ بسا اوقات بڑے بڑے نباض دھوکے میں پڑے رہتے ہیں۔ بلاشبہ مرض کے جراثیم ہمارے اجتماعی جسم کے رگ و پے میں مستقل چھاؤنیاں ڈالے پڑے ہیں اور برابر جسم کی قوت کو تحلیل کر رہے ہیں، لیکن یہ کچھ اس طرح ہمارے جسم کا جزو بن چکے ہیں کہ ہمیں ان کی خطرناکیوں کا

کوئی خاص احساس نہیں ہوتا۔ کون نہیں جانتا کہ خیانت ہمارے نظامِ اجتماعی میں چپے چپے پر اپنے اڈے جمائے بیٹھی ہے، کون نہیں جانتا کہ رشوت کی جونکیں ہمارے ایک ایک ریشے سے خون چوسنے میں مصروف ہیں، کسے نہیں معلوم کہ ضمیر فروشی نے ہر کوچہ و بازار میں نیلام گھر کھول رکھے ہیں، کس کی آنکھوں پر یہ واضح نہیں کہ جاہ طلبی آکاس بیل بنی ہوئی ہمارے شجرۂ ملت پر مسلط ہے؟ —— یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہے، لیکن ہم اس کا عام حالات میں کوئی احساس نہیں کرتے، بلکہ ان حالات کو بالکل معمولی اور فطری سمجھتے ہیں، اور ان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ انھیں دیکھ کر کبھی کوئی اضطراب نہیں ہوتا۔ پوری قوم جن جونکوں کو اپنا خون پلاتی ہے اور دق کے جن جراثیم کو اپنے پھیپھڑوں کا گوشت اور اپنی ہڈیوں کا گودا کھلاتی ہے اور جن سانپوں اور ناگنوں کو اپنی چھاتیوں کا دودھ پلا پلا کر آستین میں پالتی ہے، ان کی ساری کرم فرمائیوں کے باوجود پھر نیازمندی بھی کرتی ہے۔ یوں اخلاقی مفاسد ہماری زندگی کا لازمہ بن کر پلتے ہیں اور برابر انڈے بچے دیتے چلے جاتے ہیں ہمیں اس پر کوئی اضطراب نہیں ہوتا۔

آزمائشی مراحل

ہاں مگر جب کبھی قوم کسی غیر معمولی صورتِ حالات کا سامنا کرتی ہے اور کسی اہم مرحلے سے گزر رہی ہوتی ہے تو اس کی اخلاقی کمزوریاں بالکل کھل کر سامنے آجاتی ہیں اور پھر کسی کے لئے ممکن نہیں رہتا کہ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ سکے۔ حوادث کا بے رحم ہاتھ جب ہمارے ظاہر کے سارے خوشنما پردے الٹ کر ہمارے باطن کو بالکل عریاں کر دیتا ہے اور ایک ایک داغِ سینہ بالکل آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تو کم سے کم ایک لمحے کے لئے ضرور ہمیں یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ ہم کسی خوفناک مصیبت کا شکار ہو رہے ہیں۔

پہلی آزمائش

آج سے چار سال قبل جب دو قومی تصادم کی غیر معمولی صورتِ حالات پیش آئی تو اس نے ہماری اخلاقی صحت کی پوری حقیقت کھول کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ ہندو مسلم فسادات نے پہلی مرتبہ خوب اچھی طرح اس حقیقت کو نمایاں کر دیا کہ اپنے اصول و اخلاق کے لحاظ سے خدا اور رسول اور قرآن پر ایمان رکھنے والی قوم اپنی حریف قوم سے کسی درجے میں بھی بہتر نہیں ہے۔ اس ملت گیر حادثے میں ہماری پستیوں کو اجاگر کرنے والے کارنامے یہ تھے:

۱۔ جہاں کہیں مسلمان قلیل تعداد میں تھے اور انھوں نے مظالم کا طوفان اٹھتے دیکھا وہاں کٹ مرنے کا جذبہ پیدا ہونے کے بجائے زیادہ تر ہراس کی لہر تھی جو فضا میں پھیل گئی اور اس ہراس کی لہر نے رہی سہی قوت کو مضمحل کر دیا۔

۲۔ جہاں کہیں مسلمانوں نے غیر مسلم اقلیت کو اپنے سامنے بے بس پایا وہاں انھوں نے دوسرے علاقوں کے مظلوم مسلمانوں کا پوری بے دردی سے انتقام لیا، حالانکہ انتقام کی یہ صورت ایک مسلمان قوم کو زیب نہیں دیتی۔

۳۔ بوڑھوں اور بچوں اور عورتوں کو قتل کرنے کی جو ذلیل کارروائی غیر مسلموں نے انجام دی، ٹھیک اسی کو مسلمانوں نے بھی اختیار کیا۔

۴۔ اغوا اور زنا اور عورتوں کو ننگا کرنے اور ان کے ساتھ ہر طرح کی بدسلوکی کرنے میں مسلمان بالکل غیر مسلموں کی سطح پر پائے گئے۔

۵۔ اس پورے "جہاد" میں امامت قوم کے غنڈوں اور اوباشوں کے ہاتھ میں رہی جن کے لئے ناممکن تھا کہ وہ کسی اخلاقی حد پر جا کر رک سکتے۔

۶۔ مسلمانوں کے اندر بعض ایسے "خادم" موجود پائے گئے جنھوں نے اسلحہ کے لئے چندے جمع کر کے کھائے اور بیوپاری جنھوں نے قوم کو مصیبت میں گھرے ہوئے پا کر اسلحہ سے کھل کر نفع اندوزی کی۔

۷۔ قوم کے سامنے ایسے لیڈروں کو حالات نے بالکل نمایاں کر دیا جو اپنی جانیں ہی نہیں، اپنے مال بلکہ اپنے کتے تک سمیٹ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور جن عوام کی وہ لیڈری کیا کرتے تھے ان کو عین سیاسی مرگھٹ کے اندر گھرا ہوا چھوڑ دیا۔

یہ موقع تھا کہ جو لوگ قوم کے خادم ہونے کے یا قوم کی قیادت کے دعویدار تھے یا جن کو قوم نے اقتدار کی کرسیوں پر بٹھا رکھا تھا، وہ اپنی اجتماعی زندگی کے انتہائی خطرناک اخلاقی پہلوؤں کا جائزہ لیتے اور اصلاحِ حال کے لئے طویل منصوبہ بندی کر کے پتہ ماری کا کام ہاتھ میں لیتے۔ لیکن ایسے خادم، ایسے لیڈر اور ایسے حکمران کہیں نہ تھے۔ یہ موقع آیا اور گزر گیا۔

دوسری آزمائش

پھر غیر مسلموں کے ترکِ وطن سے ایک اور آزمائشی گھڑی نمودار ہوئی۔ پنجاب، سندھ، اور سرحد سے غیر مسلموں کے گروہ کے گروہ گھبراہٹ کی حالت میں نکل نکل کے واگہ سے پار چلے گئے اور اُن کے اموالِ متروکہ ہمارے قومی اخلاق کے لئے کسوٹی بن گئے۔ مالِ مفت کی یہ گنگا جب بہہ رہی تھی تو ہماری قوم کے امیروں اور غریبوں، شریفوں اور رذیلوں، لکھے پڑھوں اور اَن پڑھوں میں سے ہر کوئی اس گنگا سے ہاتھ رنگنے کی مسابقت میں شریک تھا۔ بڑے بڑے پارسا تک اپنی پارسائی کا جبہ اتار کر اس حمام میں ننگے ہو گئے۔ اس میکدے کے جب دروازے کھلے تو رند بچارے تو رند تھے شہر کے قاضی و محتسب بھی اپنے اپنے جام تھامے آموجود ہوئے۔ شاید ایک فی صدی، شاید دو فی صدی یا شاید زیادہ سے زیادہ پانچ فیصدی افرادِ قوم ایسے ہوں گے کہ خوانِ یغما کی اس لوٹ سے کوئی حصہ پائے بغیر رہ گئے ہوں۔ اموالِ متروکہ نے تو ہماری قوم کی اخلاقی صحت کو بالکل ناپ کے دکھا دیا کہ یہاں کیا حال ہو چکا ہے۔

تیسری آزمائش

پھر ایک تیسری آزمائش مہاجرین کی ایک کثیر تعداد کے وارد ہونے سے پیدا ہوئی۔ اس آزمائش نے ہمارے داخلی مفاسد کو اور زیادہ کھول کر رکھ دیا۔ اس موقع پر ہمارے اجتماعی جسم کو روگ لگانے والے خطرناک جراثیم جن واقعات کے ذریعے بالکل نمایاں ہو گئے وہ یہ تھے :۔

۱۔ مہاجرین کے کیمپوں کا نظم و نسق چلانے والے کارکنوں نے ہر قسم کی بدعنوانیاں کیں بعض لوگوں نے مہاجرین کے لئے باہر سے آئی ہوئی امدادی اشیا میں سے اپنا حصہ اڑایا، مہاجرین کے بچوں اور بیماروں کے لئے آنے والے دودھ میں سے "ٹیکس" وصول کیا اور پھر مظلوموں کی عزتِ نفس کو طرح طرح سے کچلا گیا۔

۲۔ نوجوان بےفکروں کے غول کیمپوں میں جا کر کوئی خدمت انجام دینے کے بجائے بسا اوقات مہاجرین کی بہو بیٹیوں کو تاکتے پھرے ہیں۔

۳۔ بعض جماعتوں کے تحت جن رضا کاروں نے مہاجرین کی خدمت کا کام سنبھالا، انھوں نے

قومی فنڈز کو بے تحاشا دودھ کے ڈبوں، بسکٹوں، پیسٹری اور پھلوں پر خرچ کر کے اپنے لئے ایک ہنگامۂ تفریح پیدا کرنے کا اہتمام کیا، درانحالیکہ ان کے کیمپوں کے چاروں طرف نوواردمہاجرین آآکے مر رہے تھے اور ان کی لاشوں کو اٹھانے تک کا انتظام نہ تھا۔

۴۔ مہاجرین کو مبتلائے مصیبت پاکر ہماری "قومی جونکوں" کی رگِ رشوت ستانی پھڑک اٹھی اور انھوں نے الاٹ منٹوں پر اور کسی جگہ منتقل ہونے کے لئے ذریعۂ سفر مہیا کرنے پر خوب نذرانے وصول کئے، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مہاجرین کے بچوں کے جنازے پڑھنے، انھیں ضروری مقاصد کے لئے عرضیاں لکھ کر دینے اور ان کو کسی دفتر تک پہنچنے کا راستہ بتانے تک کا معاوضہ طلب کیا گیا۔

۵۔ خود مہاجرین نے مکان اور زمینیں حاصل کرنے کے لئے بری طرح مسابقت، باہمی حق ماری اور اوچھے پن سے کام لیا، اپنی سابق مالی حالت کے متعلق کھلے کھلے جھوٹ بولے، اپنی جائدادوں اور کاروبار کے متعلق صریحاً غلط بیانات دیئے، اور پھر جو پہلے آگیا وہ بہتر سے بہتر اور وسیع سے وسیع عمارت پر قبضہ کر کے بعد میں آنے والے کا راستہ روک کر بیٹھ گیا۔

یہ واقعات بھی ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے سے بڑے پیمانے پر نمودار ہوئے، ہمیں وقتی طور پر ان کا بشدت احساس ہوا، لیکن ہمارے احساس نے آنکھ جھپکنے کے بعد پھر موندلی اور خوابِ خرگوش کی حالت پھر قائم ہوگئی۔

چوتھی آزمائش اس کے بعد پنجاب میں سیلاب کی آمد نے ایک مرتبہ پھر ہمیں بتایا کہ ہم کس پانی میں ہیں۔ سیلاب کی آمد پر جو کمزوریاں ابھر کے سامنے آئیں وہ یہ تھیں:-

۱۔ لاکھوں عوام جب سیلاب بلا کا شکار ہو رہے تھے تو لاہور شہر میں ایک ایسا سنگدل طبقہ بھی موجود تھا کہ مصیبت زدوں کی مدد کے لئے تو وقت اور مال صرف کرنے پر تیار نہ تھا، لیکن سیلاب کے منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے اور لوگوں کی بربادی کا تماشا کرنے کے لئے بیوی بچوں تک کو کاروں میں لاد کر گھما رہا تھا۔

۲۔ پھر یہ عبرتناک سماں بھی دیکھا گیا کہ لوگ جانیں بچا کر گھروں سے جب نکل گئے تو چوراچکے

میدان میں آ گئے اور سیلاب زدہ گھروں میں گھس کر سامان نکالنے کی وارداتیں ہونے لگیں۔ اس کے سدِباب کے لئے حکومت کو خاص فکر کرنی پڑی۔

۳۔ اسی مصیبت کے دوران میں یہ پرانا مرض بھی دوبارہ نمایاں ہو گیا کہ سیلاب زدگان کی خدمت کرنے والوں میں اکثریت ان افراد اور ان جماعتوں کی تھی جنہوں نے اگر ایک روپے کا کام کیا تو اس کے ساتھ لازماً دس روپے کا ڈھنڈورہ پیٹنے کا سامان بھی کیا۔ بعض تو ایسے بھی تھے جو یہ ساری تگ و دو بالکل انتخاب کو نشانہ بنا کر کر رہے تھے اور ان کی مختلف حرکات سے یہ "نیتِ نیک" بالکل ٹپکی پڑتی تھی۔

۴۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ سیلاب زدگان کی امداد کے لئے جو نقدی اور سامان جمع ہوتے رہے ان میں خیانت کی گئی۔ پھر خیانت کے عام روگ کی وجہ سے چندے اور سامان دینے والوں کو عام طور پر یہ بھروسہ نہیں ہوتا تھا کہ ان کا دیا ہوا جو کچھ ہے وہ ٹھیک مستحقین تک پہنچے گا۔

۵۔ حکومت کا یہ کارنامہ بھی یادگار رہے گا کہ اس نے مسلم لیگ کو جو سہولتیں اور مراعات امدادی مہم کے لئے بہم پہنچائیں، دوسری جماعتوں کو نہ صرف یہ کہ ان سے محروم رکھا بلکہ بسا اوقات ان سے کسی طرح کا تعاون کرنے یا ان کی کسی ضرورت کو پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ کرم اتنا ہی ہوتا تو بھی غنیمت تھا۔ دوسری جماعتوں کے کارکنوں کو ستایا گیا اور ان کی جمع کردہ قربانی کی کھالیں چھینی گئیں۔ یہ ہمارے حکمرانوں کا حال تھا کہ ان کو سیاسی رقابت کے احساس نے ایک مصیبت عام کے لمحے بھی نہ چھوڑا۔

یہ گھڑی بھی آئی اور گزر گئی۔ حالات وہیں رہے جہاں تھے۔

پانچویں آزمائش

ان سارے حوادث میں عبرت کے جو مناظر موجود تھے، ان پر سے اندھوں کی طرح گزر جانے والی قوم کو آخرکار ایک اور آزمائش کی کسوٹی نے پرکھا اور اسے اور زیادہ وضاحت سے بتا دیا کہ تجھ میں کھوٹ کتنا ہے اور کھرے مال کا تناسب کیا ہے۔

یہ آزمائش صوبۂ پنجاب کے انتخابات ۱۹۵۱ء کی آزمائش تھی۔

انتخابات پنجاب نے تو ہماری رہی سہی قلعی بھی کھول دی ہے، اور یہ ایک ایسی ہمہ گیر آزمائش تھی

جس نے حکمرانوں، سرکاری کارکنوں، سیاسی لیڈروں، جماعتوں کے رضاکاروں، اخبارات کے ایڈیٹروں، مذہبی رہنماؤں، برادریوں اور محنوں کے چوہدریوں اور صوبے کے عام شہریوں میں سے ہر ایک کے ذہنی، روحانی اور اخلاقی روگ کھول کھول کے ہر نگاہِ بینا کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔ یہاں ہم قوم کے ان سارے عناصر کے اخلاقی مظاہروں کا تذکرہ کرتے ہیں جو انتخابات کے پردۂ سیمیں پر پیش کئے گئے۔

(۱) ہمارے حکمرانوں نے اپنے جس اخلاق کو نمونہ بنا کر قوم کے سامنے رکھا اس کے قابلِ توجہ پہلو یہ ہیں :-

ا ـــــــ ہمارے صوبے (بلکہ مرکز تک) کے حکمرانوں نے حکومت کے عہدوں پر قابض رہتے ہوئے مسلم لیگ کی خاص طور پر سرپرستی کی، اس کے لئے پروپیگنڈا کیا، عوام کو اس کے حق میں ووٹ دینے کی تلقین کی، اور اس سلسلے میں جتنا کچھ ظاہر میں ہوا اس سے کئی گنا زیادہ پس پردہ ہوا۔

ب ـــــــ انتخابات کے لئے جو قوانین اور ضابطے بنائے گئے اور جو اسکیم وضع کی گئی اس میں خاص طور پر مسلم لیگ کی ضروریات اور اس کی کامیابی کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا۔

ج ـــــــ مختلف امیدواروں کے بکسوں کے لئے ایک دوسرے سے کھلم کھلا متمیز رنگ مقرر کرنے کے بجائے دھندلے، مرکب، مغالطہ انگیز اور مشابہ رنگ اختیار کئے گئے اور خاص طور پر جماعت اسلامی کے براؤن بکس کے ساتھ جو سرخ بکس صوبے کے ہر پولنگ بوتھ پر رکھا گیا وہ ووٹروں کے لئے بے حد مغالطہ انگیز تھا اور واقعۃً اس سے جماعت اسلامی کے اندازاً ۵ فیصد ووٹروں کو مغالطہ ہوا۔ صوبے اور ملک کے چوٹی کے منتظمین کا جب یہ حال ہو تو نیچے اس کا جو اثر ہونا چاہیے وہ ظاہر ہے۔

(۲) سرکاری کارکنوں نے اپنے اخلاق کا مظاہرہ یوں کیا :-

ا ـــــــ بعض موقعوں پر کھلم کھلا کسی ایک جماعت (خصوصاً مسلم لیگ، اور اس سے کسی قدر کم درجے پر جناح لیگ) کی جانب داری کی، اس کے حق میں ووٹ ڈلنے کے لئے واضح طور پر یا اشارۃً ووٹروں سے مطالبہ کیا، بصورتِ دیگر ووٹروں کو پریشان کیا گیا۔

ب ـــــــ ووٹرز کے حقوق کی بہم رسانی میں تساہل سے کام لیا، مثلاً بعض مقامات پر ووٹروں نے

اپنے نام کے جعلی ووٹ ڈلوائے جانے پر ٹنڈرڈ ووٹ بنوانا چاہا اور ان کو ٹال دیا گیا۔ یا کم سے کم یہ ہوا کہ بعض جگہ کافی زوردار مطالبے کے بعد ان کو ان کا یہ حق دیا گیا۔

ج ــــــ ملک کی تعلیمی حالت کی پستی کی وجہ سے بہت سے ووٹر پولنگ بوتھ پر ضابطے کی رہنمائی کے محتاج بن کے سامنے آئے لیکن سرکاری عملے نے ان کی رہنمائی کا حق ادا نہیں کیا۔

د ــــــ جعلی ووٹر بار بار اور بکثرت ووٹ ڈالتے رہے اور اکثر اوقات عملہ ان کی روش پر ہنس کر بات ٹال دیتا رہا اور جانتے بوجھتے ان پر جرح نہ کی گئی، پھر اگر مشکوک یا صریحاً جعلی ووٹروں کا معاملہ پیش کیا گیا تو نوٹس لینے سے گریز کیا گیا۔ پھر اگر مطالبے پر گرفتاریاں کی گئیں تو گرفتار شدگان میں سے اکثر کو چھوڑ دیا گیا اور بہت ہی کم تعداد ایسی تھی جنہیں قانون کے حوالے کیا گیا۔

ہ ــــــ کتنے ہی حلقوں میں ووٹروں خصوصاً عورتوں کے ہاتھوں سے ووٹ چھین لئے گئے اور یہ کارروائی سیاسی کارکنوں ہی کی طرف سے نہیں، بلکہ پولنگ اسٹیشن پر کام کرنے والے عملے نے بھی سرانجام دی ہے۔

س ــــــ عورتوں کے لئے بہت ہی کم مقامات پر پولنگ کے لئے پردے کے تسلی بخش انتظامات سرکاری عملے نے کئے۔ بالعموم فضا بے پردگی کی تھی۔

(۳) حلقوں اور برادریوں کے چوہدریوں نے انتخابات میں جو پارٹ ادا کیا اس کے دو پہلو خاص تھے:-

ا ــــــ انتخاب کے قریب آنے پر ہر سربراہ کار اور چوہدری اپنے اپنے ووٹروں کے ریوڑ کو سمیٹ کر منڈی کے چکر لگانے لگا اور اپنی بھیڑ بکریوں کی گنتی بتا بتا کر باقاعدہ سودے کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بارہا ایسا ہوا کہ پہلے کسی ریوڑ کے گڈریے نے ایک طرف معاملہ کیا اور اپنی بھیڑ بکریوں کو ہدایت کی کہ وہ فلاں کو ووٹ دیں، لیکن جب اُدھر سے معاملہ بگڑ گیا یا دوسری طرف قیمت زیادہ ملنے لگی تو اسے اپنی امت کے لئے نیا حکم جاری کرنا پڑا۔

ب ــــــ سربراہ کاروں اور چوہدریوں نے اپنے اپنے حلقۂ اثر کے ووٹروں کو جمع کر کے

ان پر دباؤ ڈالا اور ان کو دھمکایا کہ اگر اِدھر اُدھر ہوئے تو عاقبت خراب ہوگی۔ خاص طور پر مالکانِ زمین نے اپنے مزارعین کی آزادیٔ رائے کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اسی طرح مستاجروں نے اپنے اجیروں اور آقاؤں نے اپنے ملازموں کو ہانک کر جس امیدوار کے حوالے کرنا چاہا کردیا۔

(۴) مختلف جماعتوں اور امیدواروں کے انتخابی کارکن جو کثیر زرِ خرید تھے ان کی حسبِ ذیل کارروائیوں کے اثرات قوم کی اخلاقی صحت کے لئے بہت دوررس ثابت ہوں گے:۔

ا ــــــ یہ چونکہ بیشتر ان پڑھ اور بازاری قسم کے لوگ تھے، بلکہ ان میں اکثریت غنڈوں کی تھی، اس لئے ان کی طرف سے بہت گھٹیا زبان استعمال کی جاتی رہی، بہت ذلیل حرکات سرانجام دی گئیں، دوسروں کو گھسیٹنے اور اغوا کرنے کی بری سے بری چالیں چلی گئیں۔

ب ــــــ یہ لوگ پولنگ اسٹیشنوں کے قریب جعلی ووٹ بنانے کے باقاعدہ کارخانے قائم کرکے بیٹھ گئے ــــــ بعض مقامات پر تو باقاعدہ "میک اپ سیلون" اور "ڈریسنگ روم" بھی بنائے گئے ــــــ اور پھر قوم کے ہر ووٹر کو جو ان میں آسکا غلط بیانی اور جعل سازی کی تعلیم دی، ایک ایک نوجوان کو کئی کئی باپوں کی اولاد بننے اور ایک ایک عورت کو کئی کئی شوہروں کی زوجیت کا شرف حاصل کرنے کے لئے باقاعدہ درس دئیے۔

(۵) ہمارے ووٹروں کی اکثریت نے جس اخلاق کا ثبوت دیا وہ یہ تھا:۔

ا ــــــ کل ووٹروں کا پچھتر فی صدی حصہ وہ تھا جس کو سرے سے انتخاب سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی اور یہ سوال کہ ملک کی باگ ڈور کس کے حوالے کی جانی چاہیے ان کے لئے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ یہ لوگ اپنے کام کاج میں مصروف رہے یا گھروں میں بیٹھے رہے، اور انہی نے جعلی ووٹروں کو موقع دیا کہ وہ بیس بیس مرتبہ جا کے ووٹ دیں اور قلیل التعداد ہونے کے باوجود کثیر التعداد اصلی ووٹروں کی رائے کو بے اثر بنا کے رکھ دیں۔

ب ــــــ جو لوگ ووٹ دینے کے لئے آئے ان میں سے بھی بہت سے وہ تھے جو آئے نہیں تھے، لائے گئے تھے اور جنہوں نے ووٹ ڈال کر کسی نہ کسی پر احسان دھرا۔ رہا اس کی

قیمت وصول کی ہے۔

ج ——— پھر جو لوگ خود آئے، ان میں بھی کوئی قطعی رائے قائم کر کے آنے والے کم تھے ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ انھوں نے پولنگ اسٹیشن پر جا کر یا تو اپنے آپ کو اس بات کے لئے چھوڑ دیا کہ کوئی آگے بڑھ کے انھیں استعمال کرے یا پھر انھوں نے ارد گرد کے ہجوم میں جدھر بھیڑ زیادہ دیکھی۔ بعض کے ضمیر کی پستی کا حال یہ تھا کہ انھوں نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ایک شخص دیانتدار اور قابل ہے، اپنا ووٹ ایک نااہل اور ناقابل کو اس دلیل کے ساتھ دیا کہ اہل اور قابل آدمی کی کامیابی کا چونکہ امکان نہیں لہٰذا ہمارا ووٹ ضائع جائے گا۔

د ——— ہمارے ووٹروں میں سے بے شمار ایسے بھی تھے جو بار بار وعدے کر کے مکرتے رہے اور آخر کار جدھر چاہا رُخ کر لیا۔ وعدہ خلافی کے روگ سے بہت کم لوگ بچ سکے ہوں گے۔ یہاں تک کہ ہمارے سامنے ایسی قطعی مثالیں موجود ہیں کہ مسجدوں کے اماموں اور بڑے مذہبی قسم کے لوگوں نے ضمیر اور وعدے کے خلاف رائے دی ہے۔

س ——— ووٹروں میں بہت ہی قلیل تعداد ایسی ہوگی جو دباؤ اور دھمکی کا جم کر مقابلہ کر سکی ہو۔ بالعموم لوگوں نے اخلاقی قوت کے بجائے ضعف کا مظاہرہ کیا ہے۔ حالانکہ ووٹ خفیہ ڈالا جانے والا تھا۔

س ——— پھر وہ ہمارے بعض شہری اور قومی بھائی تھے جو بیس بیس پچیس پچیس کی ٹولیاں بنا کر ایک جتھے کے ساتھ پولنگ اسٹیشنوں پر گھوم گئے اور اپنے خریداروں کے ووٹوں کی تعداد میں ہزاروں کا اضافہ کر دکھایا۔ ان لوگوں کی پستیٔ فطرت کا حال یہ تھا کہ انھوں نے فخریہ اس بات کا اظہار کیا کہ ہم نے بارہ یا پندرہ یا بتیس یا اکیاون مرتبہ ووٹ ڈالے ہیں۔

ص ——— خواتین ووٹروں کی اکثریت ایسی تھی کہ جس کے لئے پولنگ کا ہنگامہ ایک اچھا خاصا میلہ بن گیا تھا، یہ بھڑکیلے لباس پہن کر نکلیں اور شانِ بے پردگی کے ساتھ بعض اوقات فحش حرکات کے ساتھ انھوں نے پولنگ اسٹیشن پر اپنا وقت گزارا۔

پھر یہ بھی اخلاقی انحطاط کا مظاہرہ تھا کہ اکثر زنانہ پولنگ اسٹیشنوں کو چاروں طرف سے تماش بینوں نے گھیرے رکھا تاکہ وہ اپنی ماؤں بہنوں کو آتے جاتے تاک سکیں۔

(۶) ہمارے اخبار نویس بھی اس کھیل میں اپنا پارٹ ادا کرنے سے کسی طرح قاصر نہیں رہے ملت کے ان ذہنی معلموں نے اخلاقِ حسنہ کی یہ یہ مثالیں قائم کیں:-

ا ــــــ ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو کہ جس نے کسی نہ کسی جماعت طلب فرد یا گروہ سے بالکل ویسا ہی معاملہ نہ کیا ہو جیسے حق مہر لے کر ایک عورت کسی مرد سے نکاح کا معاملہ کرتی ہے۔

ب ــــــ ان حضرات نے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے، غیر موجود حالت کو موجود اور موجود حالت کو غیر موجود کر کے دکھانے کے فن کا "بے پناہ" مظاہرہ کیا ہے۔

ج ــــــ اپنے ممدوحین کی قصیدہ گوئی میں زمین کے قلابے آسمان کے ساتھ ملانے کے ساتھ ساتھ ان سے اختلاف رکھنے والوں پر وہ وہ بہتان تراشے ہیں اور ان کے لئے ایسے ایسے کلماتِ استہزاء استعمال کئے ہیں کہ ابتذال اور رکاکت کو وجد آ گیا ہوگا۔

(۷) امیدواروں اور انتخاب میں شریک ہونے والی جماعتوں ــــــ خصوصاً مسلم لیگ ــــــ کی پروپگنڈہ مشنری نے قومی ذہن کو بگاڑنے، جھوٹ اور بدگوئی کا زہر پھیلانے، الزام تراشی کا روگ لگانے، غلط فہمیوں کا دھواں چھوڑ کر عوام کے فکر کو پراگندہ کرنے کے لئے جو عظیم الشان اور جلیل القدر خدمات انجام دی ہیں وہ ہماری تاریخ سیاست میں زرّیں حروف سے منقش ہونی چاہئیں۔

(۸) سیاسی لیڈروں اور امیدواروں نے انتخاب میں جو کھیل کھیلا ہے، وہ ایک آ مسٹ یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ حضرات قوم کے سامنے اس دعوے کے ساتھ آئے تھے کہ تمہارے حکمران اور کارفرما بننے کے سب سے زیادہ اہل ہم ہیں، لیکن انھوں نے اس کا ثبوت ذیل کی کارروائیوں سے دیا ہے:-

ا ــــــ اوپر جتنے مفاسد کا تذکرہ کیا گیا ہے اُن سب کے اصل محرک اور بانی مبانی

اور سرپرست خود بھی حضرات تھے۔ انھوں نے بھی بداخلاقی کو اپنی انتخابی منصوبہ بندی میں خود شامل کیا، کارکنوں اور ووٹروں کو انھی نے ہر گمراہی کی چھوت لگائی اور یہی وہ اصل منبع ضلالت تھے جنھوں نے کرسیاں حاصل کرنے کے لیے جو سب سے بڑی پوری قوم کی اخلاقی متاع کو داؤں بنا کر لگا دیا۔

ب ـــــ پھر یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے پاکستان کے عوام کو کہیں برادری کی عصبیت کا، کہیں پنجابی اور ہندوستانی کی کشمکش کا اور کہیں امیر اور غریب کے تنافر کا روگ لگانے کی ہر تدبیر اختیار کی۔

(۹) بحیثیت مجموعی قوم کی اسفلیت اور اخلاقی حس کا پول پوری طرح کھل گیا ہے کہ اس کے سامنے جب ایک طرف علم و اخلاق کو اور دوسری طرف جہل و فسق کو رکھا گیا تو اس نے اپنا اجتماعی ووٹ علم و اخلاق کو نہیں جہل و فسق کو دیا۔

علاوہ بریں بداخلاقی کے اتنے ہمہ گیر اتنی بی ہنگامے کو دیکھ کر ایسے حساس لوگ کہیں نہ ابھرے جو اصلاح کا علم اٹھا کر اس سیلاب کے سامنے کھڑے ہو جاتے، اور اگر یہ بھی نہ کر سکتے تو کم سے کم کوئی آنسو ہی بہا دیتے اور کوئی آہ ہی کر دیتے۔ یہ بھی قوم کے اخلاقی حس کے مردہ ہو جانے کی ایک خطرناک علامت ہے۔

موقعِ عبرت

اس مرحلے پر ذرا سکون سے حالات پر غور کیجیے۔ انتخابات کے ہنگامے نے ایک بار پھر آپ کا اندرونی اخلاقی حال کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ خدارا اپنے رستے ہوئے ناسوروں، اپنے گندے داغوں، اپنے زہریلے پھوڑوں اور ان سے بہتی ہوئی پیپ سے آنکھیں چرا کر نہ نکل جائیے، اور نہ دفر اموشی کی چنیا بیگم کا سہارا لے کر یا بند باتی پن کی مئے آتشیں کے جام چڑھا کر، یا خوش فکریوں کی معجونِ فلک سیر نوش فرما کر عبرت کے مواقع کو ضائع نہ کر دیجیے۔ ایک مرتبہ مردانہ وار ہمت کر کے اپنا حالِ زار اچھی طرح خود دیکھ لیجیے۔

یہ کمزوریاں، یہ امراض، یہ مفسدات جو آپ نے اپنے اجتماعی نظامِ جسمانی کے اندر پال

رکھے ہیں، ان کی پوری پوری تشخیص کر کے ان کے ازالے کی فکر کیجیے۔ ورنہ یہ داخلی دشمن قوتیں آپ کو ایک دن اچانک پچھاڑ کے رکھ دیں گی، اور پھر اپنے اوپر ماتم کرنے سے کچھ نہ بنے گا۔

جماعت اسلامی کا تعمیری پروگرام

جماعت اسلامی روزِ اول سے ان حالات کو پیشِ نظر رکھ کر قوم اور پھر پوری انسانیت کی اصلاح کا کام کرنے میں مصروف ہے۔ اس کے سامنے قوم کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر کے ساری دنیا کی اخلاقی فلاح کا پروگرام تھا جس کے تقاضوں کے تحت وہ عام سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے کنارہ کش ہو کر کئی سال تک اپنی داخلی تعمیر میں مصروف رہی۔ یہی پروگرام تھا جس کے پیشِ نظر اس نے جماعتی تنظیم کے مروجہ نقشوں اور سیاسی تحریکوں کے سطحی، نمائشی اور جذباتی مظاہروں کو ترک کر کے ٹھیک اسلامی طریقِ تنظیم اور اسلامی اندازِ تحریک کو اختیار کیا۔ یہی پروگرام تھا جس کے لئے اس نے توسیع کے مقابلے میں ہمیشہ استحکام کو ترجیح دی۔ پھر یہی وہ پروگرام تھا جس کو ساتھ لے کر وہ ہر مرحلے میں قوم کے سامنے اسلامی اخلاقیات کی پابندی کے ساتھ اپنا دینی فرض ادا کرتے ہوئے شہادتِ حق دیتی رہی اور قوم کے سامنے عملاً یہ واضح کرتی رہی کہ ایک مسلمان کا طرزِ عمل کسی معاملے میں کیا ہونا چاہیے۔ پھر یہی وہ پروگرام تھا جس کو اولین اہمیت دیتے ہوئے وہ انتخابات کے گندے میدان میں آئی اور اسی پروگرام کی خاطر اس نے اپنے اخلاقی اصولوں کی حفاظت کرتے ہوئے پنجاب اسمبلی کی سیٹوں کو قربان کر دیا، لیکن اس کے ایک ایک کارکن کا چہرہ اس احساس سے آج چمک رہا ہے کہ انتخابی ہنگامے میں انہوں نے عملاً یہ نمونہ دکھایا کہ ایک مسلم لیڈر کو، ایک مسلم نمائندے کو ایک مسلم پولنگ ایجنٹ کو، ایک مسلم سیاسی کارکن کو، ایک مسلم ووٹر کو کن حدودِ اخلاق کا پابند ہونا چاہیے۔ پھر جماعت کا یہی پروگرام تھا جس نے ہر مرحلے میں جہاں ایک طرف قوم کے واقعی اسلام پسند اور صالح اور با اخلاق عناصر کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے وہاں اسلام سے بے نیاز اور اخلاقی حس سے محروم عناصر کو دور دھکیل دیا ہے۔

یہ ایک مختصر سا گروہ ہے جس کے سامنے قوم کی اخلاقی حالت کا یہ افسوسناک نقشہ ہے کہ

ہزار آدمیوں میں سے بمشکل ایک آدمی ایسا ملتا ہے جو کیرکٹر کا پختہ ہو، بقیہ اکثریت وہ ہے جسے آزمائش کا ہر لمحہ ایک بے رحم کسوٹی بن کر کھوٹا کر کے پرے پھینک دیتا ہے۔ اخلاقی تعمیر و اصلاح کا لمبا اور دقیق کام کرنے کے لئے یہ طاقت میدانِ عمل میں موجود ہے۔ لیکن یہ صورتِ حال بڑی ہولناک ہے کہ اصلاح کرنے والے اس قلیل گروہ کے مقابلے میں جان بوجھ کر قوم میں اخلاقی بگاڑ پیدا کرنے اور بگاڑ پیدا کر کے وقتی طور پر ناجائز فائدے اٹھانے والوں کی کثرت ہے۔ ہم اگر بھلائی کے فروغ کے لئے دس کی تعداد میں نکلتے ہیں تو برائی کے خادم سینکڑوں کی تعداد میں پھیل جاتے ہیں، ہم اگر معروف کی دعوت دینے کے لئے ایک اجتماع منعقد کرتے ہیں تو منکر کے سرپرست اس دعوت کو بے اثر بنانے والے ہنگاموں میں ہزاروں کے وارے نیارے کر دیتے ہیں، ہم اگر تعمیرِ اخلاق کے لئے کچھ سامان فراہم کرتے ہیں تو قومی اخلاق کی تخریب کرنے والے اس سے کہیں گنا زیادہ ذرائع و وسائل کے ساتھ آموجود ہوتے ہیں۔

یہ حالات ہمت آزما ضرور ہیں، مایوس کن نہیں ہیں۔ ہمیشہ ہر اصلاح پسند طاقت کو یہی حالات پیش آئے ہیں اور اصلاح کی صبح جب بھی نمودار ہوئی ہے اسی قسم کی طبق بر طبق تاریکیوں کا سینہ چیر کر نمودار ہوئی ہے۔ ان کو ہم یہاں اس لئے واشگاف طور پر سامنے رکھ رہے ہیں کہ قوم کے جو افراد اجتماعی زندگی کی فلاح سے واقعی ہمدردی رکھتے ہوں اور جن کے دلوں میں درحقیقت عوام کے لئے کوئی خیر خواہی موجود ہو وہ اپنی ذمہ داریوں کا کچھ احساس کریں۔

ضرورت دو چیزوں کی ہے:

ایک یہ کہ جن لوگوں کی نگاہ میں قوم کی اخلاقی صحت کو بچانے کی کچھ بھی اہمیت ہو وہ آگے بڑھیں اور اس واحد منظم تحریک کا ساتھ دیں جو تعمیرِ اخلاق کا پروگرام اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ خصوصیت سے حساس نوجوانوں کو اس ذمہ داری کے لئے اپنے کندھے پیش کرنے چاہئیں۔ قوم کے اندر بڑے پیمانے پر اگر ایک منظم طاقت اس پر تل جائے کہ وہ بداخلاقی کے سرچشموں کا سدِ باب کر کے دم لے گی اور اجتماعی زندگی کو بداخلاقی روگ سے پاک کر کے چھوڑے گی تو مفاسد کا فروغ رک سکتا ہے۔ جماعتِ اسلامی کو ہر دور کا سے گزرنے ہونے کا رکن برابر بڑھے ہیں اور تازہ انتخابی مہم سے گزرتے ہوئے بھی اس کی قوت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے، لیکن حالات اس سے کہیں زیادہ قوت کے متقاضی ہیں۔

دوسرے یہ کہ قوم میں ایسی رائے عام اور خیر و شر کا اتنا شعور پیدا ہو جانا چاہیے کہ وہ خود یہ پہچاننے لگے کہ اس کی واقعی بھلائی چاہنے والے کون لوگ ہیں اور اس کو اخلاقی روگ لگا کر ناجائز فائدے اٹھانے والے عناصر کونسے ہیں۔ وہ اپنی اخلاقی صحت کا تحفظ کرنے کے لئے جراثیم کے اڈوں کا سدّباب کرنے پر تُل جائے۔ وہ ان سیاست بازوں کے مقابلے کے لئے کیل کانٹے سے لیس رہے جو اس کے شہریوں کو صحیح تربیت دینے، ان کے فکر کی تعمیر کرنے اور ان کو شعور دلانے سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں اور ان کو بہکا کر، پھسلا کر اور اکسا کر ان سے وقتی طور پر فائدہ اٹھا کے اپنی راہ لیتے ہیں۔

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ؟

ہمارے سامنے پتّہ ماری کا ایسا کام ہے جسے کرنے پر کوئی دوسرا یہاں تیار نہیں۔ اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹانے کے لئے صرف وہی لوگ آگے بڑھیں جو برسوں ایک دہقان کے سے صبر کے ساتھ محنت کر سکتے ہوں اور آزادانہ اپنی محنت کے نتائج وصول کرنے کے لئے جھولی نہ پھیلا دیں۔ یہ ایک ایسی مہم ہے جس کی کامیابی کا راستہ سیکڑوں ناکامیوں میں سے ہو کر گزرتا ہے، لہٰذا یہ مہم اگر سر ہوگی تو ان عالی ہمت اور فراخ حوصلہ مردوں کے ذریعے ہوگی جنھیں ہر شکست اور زیادہ سرگرمِ عمل کر دے، اور جو راستے کی ہر ٹھوکر کو ایک تازیانہ سمجھتے ہوئے اقدام کر سکیں۔

جب تک ہماری اجتماعی زندگی کی اخلاقی صحت مضبوط نہ ہوگی، اسلامی نظام کے قیام و نفاذ اور اس کے نشوونما و ارتقاء کا تو کیا سوال، خالص مادی حیثیت سے بھی ہم دنیا میں ایک کمزور قوم بن کے پڑے رہیں گے اور دیمک کی چھیڑ سے اندرونی مفاسد کا کبھی ازالہ نہ ہوگا!

اس مہم میں ہمارا ساتھ دینے کے لئے کون آگے بڑھتا ہے؟

کاروائی[1] مجلسِ شوریٰ جماعتِ اسلامی پاکستان

منعقدہ ۱۵-۱۹ اپریل ۵۱ء

(میاں طفیل محمد صاحب قیم جماعت اسلامی پاکستان)

حسب پروگرام مجلس شوریٰ جماعت اسلامی پاکستان کا ایک خاص اجلاس ۱۵ تا ۱۹ اپریل ۵۱ء زیر صدارت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان لاہور میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں مجلس شوریٰ کے حسب ذیل ارکان شریک ہوئے:

(۱) مولانا امین احسن صاحب اصلاحی، امیر جماعت اسلامی حلقہ لاہور۔

(۲) جناب ابوالسلام نعیم صدیقی صاحب، ایڈیٹر ماہنامہ چراغ راہ، کراچی۔

(۳) مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، رئیس دارالعروبہ گوجرانوالہ و امیر جماعت اسلامی حلقہ گوجرانوالہ

(۴) چوہدری علی احمد خاں صاحب، قیم جماعت اسلامی حلقہ گوجرانوالہ۔

(۵) مولانا عبدالغفار حسن صاحب، امیر جماعت اسلامی شہر سیالکوٹ۔

(۶) چوہدری محمد اکبر صاحب، امیر جماعت اسلامی ضلع سیالکوٹ۔

(۷) ملک محمد سعید احمد صاحب امیر جماعت اسلامی حلقہ راولپنڈی۔

(۸) مولانا حکیم عبدالرحیم صاحب اشرف، امیر جماعت اسلامی حلقہ لائل پور۔

(۹) جناب خان محمد باقر خاں صاحب، امیر جماعت اسلامی حلقہ ملتان۔

(۱۰) جناب خان محمد ربانی صاحب، قیم جماعت اسلامی حلقہ ملتان۔

(۱۱) چوہدری نذیر احمد صاحب، امیر جماعت اسلامی ضلع ملتان

(۱۲) خان سردار علی خاں صاحب، امیر جماعت اسلامی حلقہ صوبہ سرحد۔

[1] رسالہ ترجمان القرآن میں مجلس شوریٰ کی روداد کا صرف عام دلچسپی کا حصہ دیا جا رہا ہے۔ مکمل روداد الگ شائع کی جائے گی۔

(۱۳) فضل معبود صاحب، امیر جماعت اسلامی، پشاور شہر و چھاؤنی۔

(۱۴) مولانا عبدالحق صاحب، امیر جماعت اسلامی حلقہ ریاست بہاول پور۔

(۱۵) سید امیر الدین صاحب، قیم جماعت اسلامی حلقہ ریاست بہاول پور۔

(۱۶) چوہدری غلام محمد صاحب، قیم جماعت اسلامی حلقہ سندھ۔

(۱۷) طفیل محمد، قیم جماعت اسلامی پاکستان۔

جناب محمد عبدالجبار غازی صاحب اور مولانا حکیم محمد عبداللہ صاحب بیماری کی وجہ سے تشریف نہ لا سکے۔ جناب سلطان احمد صاحب امیر جماعت اسلامی حلقہ سندھ و کراچی مشرقی پاکستان گئے ہوئے تھے اور مولانا صدرالدین صاحب کے تشریف نہ لانے کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔

۸ اپریل کو مجلس کا اجلاس ملک نصراللہ خاں صاحب عزیز کے مکان پر منعقد ہوا اور اس روز وہ بھی شریک اجلاس رہے۔ باقی اجلاسوں میں وہ بیماری کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔

ایجنڈے کے اجراء کے بعد جو تجاویز اور مشورے مرکز میں موصول ہوتے رہے ان کو اور اصل ایجنڈا کو ملا کر ایجنڈا کو از سر نو مرتب کر دیا گیا۔ اور مجلس کی کارروائی اس نئے ایجنڈے کے مطابق ہوئی۔

مجلس شوریٰ کے کل دس اجلاس منعقد ہوئے۔ اس میں جو فیصلے ہوئے وہ نمبروار درج ذیل ہیں:

پنجاب کے حالیہ انتخابات کے نتائج کو دیکھتے ہوئے آیا الیکشن کے ذریعے یہاں اصلاح ممکن ہے؟

سب سے پہلے مجلس شوریٰ نے اس مسئلے پر غور کیا کہ پنجاب میں حالیہ انتخابات کے نتائج اور ان تمام خلاف قانون و اخلاق حرکات کے پیش نظر جن کا ارتکاب مختلف سیاسی پارٹیوں، آزاد امیدواروں اور خود حکومت کی انتظامی مشینری کی طرف سے انتخابات کے موقع پر اس قدر وسیع پیمانے پر کیا جاتا ہے، ابھی ابھی ہمارے سامنے کیا جا چکا ہے اور بظاہر ایک مدت تک اسی طرح کیا جاتا رہے گا، آیا الیکشن کے ذریعہ سے اصلاح ممکن ہے؟ اگر مجلس کی رائے میں یہ ممکن ہو تو انتخابات کے ذریعے انقلاب و اصلاح کی کوشش کو جاری رکھا جائے ورنہ اس مقصد کے حصول کے لئے کوئی دوسری تدبیر سوچی جائے۔

اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد مجلس شوریٰ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ اُن تمام خرابیوں کے باوجود جو انتخاب کے موجودہ قوانین اور طریقوں میں پائی جاتی ہیں، اور ان تمام اخلاقی کمزوریوں کے باوجود جو ہمارے عوام اور خواص میں موجود ہیں اور پنجاب کے پچھلے انتخابات میں بالکل نمایاں ہو کر سامنے آچکی ہیں۔ اور ان تمام ناجائز مداخلتوں کے باوجود جن کا ارتکاب حکومت کی انتظامی مشینری نے خود حکومت ہی کے بنائے ہوئے قوانین اور ضوابط کے خلاف پنجاب کے پچھلے انتخابات میں کھلم کھلا کیا اور جن کا ارتکاب ایک مدت تک اس کی طرف سے اُن تمام انتخابات میں ہوتے رہنے کا اندیشہ ہے جو پاکستان میں کہیں منعقد ہوں، اور ان تمام بداخلاقیوں اور بے ضابطگیوں کے باوجود جن کا ارتکاب مخالف سیاسی پارٹیاں انتہائی بے باکی کے ساتھ اور بڑے وسیع پیمانے پر عام انتخابات میں کرتی ہیں، کر چکی ہیں اور بظاہر ایک مدت تک کرتی رہیں گی، اور اس کے باوجود کہ جماعت اسلامی کے پاس وسائل اور مردانِ کار کی بہت کمی ہے، اس معاملہ میں مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ آخر کار یہاں آئینی ذرائع سے اصلاح کی جا سکے گی۔

مجلس شوریٰ جن ٹھوس حقائق کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچی ہے وہ یہ ہیں کہ پنجاب کے پچھلے انتخابات میں بہت محدود ذرائع کے ساتھ جماعت کی صرف پانچ مہینے کی انتخابی جدوجہد سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) پنجاب کے ۲۷ انتخابی حلقوں میں تقریباً پچاس ہزار آدمی ایسے نکلے جنہوں نے ہماری انتخابی پالیسی کو صحیح سمجھ کر ووٹر کے عہد نامے پر دستخط کئے۔

(۲) ان حلقوں میں ۳۹۰ بستیاں ایسی نکلیں جنہوں نے صالح نمائندوں کے انتخاب کے لئے اپنی مقامی پنچایتیں بنائیں۔

(۳) ان حلقوں میں جو مرکزی پنچایتیں بنائی گئیں ان میں ۲۱۹ نمائندوں نے عملاً شرکت کی اور اپنی حد تک پوری دیانتداری کے ساتھ ۵۲ ایسے آدمیوں کو اپنے اپنے حلقوں کی نمائندگی کے لئے چنا جو علمی اور اخلاقی حیثیت سے نمایاں طور پر دوسری پارٹیوں کے امیدواروں اور آزاد امیدواروں کے مقابلہ میں فائق تھے اور جن کی سیرت پر ان کے مخالفین بھی کوئی حرف نہ رکھ سکے۔

(۴) اس انتخابی جدوجہد کے دوران میں عام پبلک میں سے سترہ سو ایسے نئے آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے ہمارے کارکنوں کا پوری طرح سے ہاتھ بٹایا اور بغیر کسی ذاتی غرض یا لالچ کے اُن تمام اخلاقی پابندیوں کے ساتھ جو ہم نے اپنے کارکنوں پر عائد کر رکھی تھیں پوری طرح جان لڑا کر کام کیا۔

(۵) باوجودیکہ پنجاب کے اتنے وسیع رقبوں میں جماعت کے تین چار ہزار کارکنوں نے اتنے وسیع پیمانے پر انتخابی جدوجہد کی اور اس میں مخالف جماعتوں اور امیدواروں کی شدید بداخلاقیوں اور بے ضابطگیوں کا ان کو مقابلہ کرنا پڑا، تاہم پولنگ کے انتہائی بحرانی زمانے میں بھی جماعت کے کارکنوں نے بحیثیت مجموعی اخلاقی طہارت اور ضابطہ وقانون کی پابندی کا ایسا بے نظیر نمونہ پیش کیا جس کا اعتراف حکومت کے عمّال اور مخالف پارٹیوں کے کارکنوں تک کو کرنا پڑا۔ الیکشن کے پورے کام کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ دو چار حلقوں کے سوا پورے پنجاب میں کہیں جماعت کے کارکنوں سے کسی اخلاقی کمزوری یا قانون وضابطہ کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہیں ہوا اور ان دو تین حلقوں میں بھی جماعت کے کارکن بحیثیت مجموعی اس میں ملوث نہیں ہوئے بلکہ چند منفرد کارکنوں سے ـــ اور زیادہ تر نئے کارکنوں سے ـــ اس کا صدور ہوا۔

(۶) پورے پنجاب کی اس انتخابی جدوجہد میں جماعت اور پنچایتوں کا مجموعی خرچ صرف ایک لاکھ ستائیس ہزار روپیہ ہے۔ درآں حالیکہ مقابلہ اُن لوگوں سے تھا جنہوں نے بعض جگہ ایک ایک سیٹ پر قریب قریب اتنا روپیہ خرچ کیا ہے۔

(۷) باوجودیکہ پنجاب کے اس انتخاب میں حکومت کے دباؤ، زمینداری کے دباؤ، برادری کے تعصب، اور روپے کے لالچ سے ووٹ حاصل کرنے کی بے تحاشا اور بہت بڑے پیمانے پر کوششیں کی گئیں اور ہر طرح دھاندلیوں سے کام لیا گیا، پھر بھی جماعت اسلامی کی دعوت پر پنچایتی نمائندوں کے حق میں ۲۱۷۸۵۹ آدمیوں نے ووٹ دیئے۔ (یہ شمار ووٹروں کا ہے نہ کہ ووٹوں کا، کیونکہ اکثر مقامات پر ایک ایک ووٹر کو دو دو آدمیوں کے لئے اپنا ووٹ استعمال کرنا تھا)۔ ان لوگوں کے ووٹ بہرحال دھن، دھونس، دھوکے اور دھاندلی کے ذریعہ سے تو کسی جگہ بھی حاصل نہیں کئے گئے۔ البتہ اس کا امکان ہے کہ بعض مقامات پر پنچایتی نمائندوں کو اُن کی برادری کے لوگوں نے برادری کے تعصب

کی بنا پر رائے دی ہو۔ اگر ہم مبالغہ کے ساتھ ایسے لوگوں کی تعداد کا تخمینہ مذکورۂ بالا تعداد کا ۱/۴ بھی لگائیں پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ پنجاب کے ان حلقوں میں جنہیں ہم نے انتخابی جدوجہد کے لئے اپنے چارج میں لیا تھا کم از کم ایک لاکھ ساٹھ ہزار آدمی ایسے ضرور تھے جنہوں نے ہر دھمکی اور ہر لالچ کو نظر انداز کر کے خالص اصول کی خاطر اپنا ووٹ استعمال کیا۔

(۸) خصوصیت کے ساتھ جو چیز ہمارے لئے انتہائی قابل اطمینان ہے وہ یہ ہے کہ اس انتخابی جدوجہد میں جتنی خواتین نے پنچایتی نمائندوں کے لئے کام کیا انہوں نے ہر جگہ شرعی پردے کے تمام حدود کی پوری طرح پابندی کی۔ درآں حالیکہ ایک آدھ پولنگ سٹیشن کے سوا پورے پنجاب کا کوئی پولنگ سٹیشن ایسا نہیں تھا جہاں زنانہ پولنگ کے وقت حکومت اور سیاسی پارٹیوں اور مخالف امیدواروں نے پردے کے حدود کا کچھ بھی لحاظ کیا ہو۔

یہ نتائج اس حالت میں نکلے ہیں کہ:۔

(۱) جماعت کو انتخابی جدوجہد کے آغاز ہی میں پریس کی طاقت سے محروم کر دیا گیا اور اس کے روزانہ اخبار بند کر دیئے گئے۔

(۲) پورے پریس اور خبر رساں ایجنسیوں نے جماعت کا عملاً بائیکاٹ کیا اور پریس کی اکثریت جماعت کی شدید مخالف رہی۔

(۳) اخبارات، رسائل اور اشتہارات اور تقریروں کے ذریعے سے جماعت کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈا کی نہایت مکروہ اور گھناؤنی مہم چلائی گئی اور خاص طور پر مولوی صاحبان اور پیروں کے ذریعہ سے مذہبی بدگمانیاں پھیلانے کا ایک طوفان برپا کر دیا گیا۔

(۴) جماعت کے کارکن پہلی مرتبہ انتخاب کے میدان میں آترے تھے۔ ان کی اکثریت کو پہلے سے انتخاب کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور اخلاقی قیود اور قانون وضابطے کی پوری پابندی کے ساتھ الیکشن لڑنے کا تو موجودہ جمہوریت کی تاریخ میں یہ شاید پہلا تجربہ تھا۔

ان وجوہ سے مذکورۂ بالا نتائج کو دیکھ کر مجلس شوریٰ یہ سمجھتی ہے کہ ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ

نہیں ہے اور ہم کو پوری توقع ہے کہ اگر ہم رائے عام کی تربیت اور کارکنوں کی تیاری اور باشندگانِ ملک کی اخلاقی اصلاح کے لئے پیہم کوشش کرتے چلے جائیں تو آخرکار پُرامن آئینی ذرائع ہی سے یہاں اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے ۔ لہٰذا انتخابات کے بارے میں جماعت کی پالیسی کو حسبِ سابق جاری رہنا چاہیے اور جہاں کہیں ملک میں انتخابات ہوں اُن میں حصہ لینے کی کوشش کرنی چاہیے ۔

۲۔ طریقۂ انتخاب کی اصلاح کا مسئلہ

پنجاب کے تازہ انتخابی تجربے کے دوران میں یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی گئی ہے کہ ایک جمہوری نظام میں انتخابات کی آزادی اور صحت بنیادی اہمیت رکھتی ہے اور پوری قومی زندگی کی بہتری کا انحصار اس پر ہے کہ عام رائے دہندے آزادی کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق اپنے ووٹ کا استعمال کر سکیں۔ اگر انتخابات میں حکومت کی طاقت کے ذریعہ سے مداخلت کی جائے، یا بااثر لوگ اپنی طاقت کے بل پر ووٹ حاصل کریں، یا دولت مند لوگ اپنے مال سے ووٹ خریدیں، یا رائے عام کو ناجائز طریقوں سے دھوکا دینے کی کوششیں کی جائیں، یا رائے شماری میں دھاندلیوں سے کام لیا جائے، تو اس کے نتائج اس قدر دُور رس ہیں کہ اِن سے نہ صرف پورے ملک کا نظام بگڑ سکتا ہے بلکہ اس کا بھی امکان ہے کہ لوگ آئینی ذرائع سے مایوس ہو کر غیر آئینی ذرائع کی طرف متوجہ ہو جائیں اور پوری قومی زندگی کا ارتقاء پُرامن جمہوریت کے راستے سے ہٹ کر دہشت پسندی، ڈکٹیٹرشپ اور خونی انقلاب کے راستے کی طرف مڑ جائے۔ اس لئے مجلس شوریٰ یہ ضروری سمجھتی ہے کہ تمام اُن عناصر سے جو انتخابات کے ساتھ بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رکھتے ہیں خواہ وہ اربابِ حکومت ہوں، یا سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اور کارکن ہوں، یا آزاد امیدوار ہوں، اپیل کی جائے اور پیہم کی جاتی رہے کہ وہ اپنی شخصی یا جماعتی اغراض کی خاطر ملک کو اتنے بڑے نقصان اور خطرے میں مبتلا نہ کریں اور انتخابات کو دھن، دھونس، دھوکے اور دھاندلی سے پاک رکھنے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں مجلس شوریٰ کی رائے یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کو ہر انتخاب کے موقع پر خصوصیت کے ساتھ ان ناجائز ذرائع کے خلاف تبلیغ کرنی چاہیے ، ان کے نقصانات تقریر اور تحریر میں پوری وضاحت کے

ساتھ بیان کرنے چاہئیں اور عام طور پر یہ بات لوگوں کے ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ ان تدابیر کے استعمال سے بڑھ کر اس ملک کے ساتھ اور کوئی غداری نہیں ہو سکتی۔

۴۔ انتخابات کے قواعد اور طریقِ کار میں ترمیم کی ضرورت

مجلس شوریٰ نے اس امر پر بھی غور کیا ہے کہ دوسری اصلاحات کے علاوہ انتخاب کے قواعد اور طریق کار میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ خصوصیت کے ساتھ حسب ذیل اصلاحات ضروری ہیں:-

(۱) فہرست رائے دہندگان اس تفصیل کے ساتھ مرتب ہونی چاہیئے کہ اس میں ووٹر کے نام، اس کے باپ کے نام، اس کی قومیت، اس کی عمر، اس کی تعلیم، اس کے پیشے اور اس کے مکمل پتے کی تصریح ہو۔ نیز یہ فہرستیں مردم شماری کے طریقے پر محلہ وار مرتب ہونی چاہئیں، تاکہ جعلی ووٹوں کا با آسانی سراغ لگایا جا سکے۔

(۲) جعلی ووٹوں کی روک تھام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک ایسا کیمیاوی رنگ تجویز کیا جائے جو کافی مدت تک کسی طرح مٹایا نہ جا سکتا ہو اور ہر ووٹر کے ہاتھ یا انگلی پر پولنگ سٹیشن چھوڑنے سے پہلے لازماً اس کا نشان لگا دیا جائے۔

(۳) تعزیرات پاکستان کے باب نمبر ۹ (الف) میں جن باتوں کو انتخابی جرائم (ELECTION OFFENCES) قرار دیا گیا ہے، ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۹۶ نے ان سے فائدہ اٹھانے کے حق سے مستغیث کو عملاً محروم کر دیا ہے جس کی وجہ سے انتخابات میں اتنے وسیع پیمانے پر ناجائز دباؤ کے استعمال، ووٹوں کی خرید و فروخت اور سراسر جھوٹے پروپیگنڈے کے باوجود شاذ و نادر ہی کبھی کوئی شخص ان دفعات سے فائدہ اٹھا سکا ہے۔ لہٰذا استغاثہ کی راہ میں دفعہ ۱۹۶ مذکورۂ بالا کی عائد کردہ رکاوٹ کو دور ہونا چاہیئے تاکہ مستغیث عدالت میں براہِ راست جا کر انصاف حاصل کر سکے۔

(۴) جب کسی علاقے میں انتخابات کے انعقاد کا اعلان ہو جائے تو ایسی تمام پارٹیوں اور ان کے لیڈروں اور ایسے تمام اشخاص کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے اور غلط بیانیوں کو قطعی طور پر ممنوع ہونا چاہیئے جنہوں نے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا ہو۔ اس غرض کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس فعل

کو بھی انتخابی جرائم (ELECTION OFFENCES) میں شامل کیا جائے اور متعلقہ پارٹیوں اور اشخاص کو یہ حق دیا جائے کہ وہ جھوٹا پروپیگنڈا یا غلط بیانی کرنے والے لوگوں کے خلاف براہِ راست استغاثہ دائر کر سکیں۔

اس سلسلے میں تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۱۷۱- ایف بالکل ناکافی ہے۔

(۵) کاغذات نامزدگی پُر کرنے کے لئے گزٹ میں جہاں فارم کا نمونہ دیا جاتا ہے وہیں اُسے پُر کرنے کے لئے واضح ہدایات بھی دی جانی چاہئیں بلکہ نمونہ کے طور پر ایک فارم پُر کر کے شائع کر دینا چاہئے تاکہ کاغذات نامزدگی پُر کرنے کا معاملہ بالکل جُوا کھیلنے کا ہم معنی بن کر نہ رہ جائے۔ نیز قواعد میں اس کی گنجائش ہونی چاہئے کہ اگر مجسٹریٹ کو کاغذات نامزدگی پر کوئی اعتراض ہو تو اس کے مطابق کاغذات کی اصلاح کا موقع دیا جائے۔

(۶) تمام اُمیدواروں کے بکس سفید رنگ کے ہونے چاہئیں اور ہر اُمیدوار کے بکس پر اس کا نام اور جس پارٹی سے وہ تعلق رکھتا ہے اس کا نام لکھا جانا چاہئے۔ نیز ہر بکس پر ایک عام فہم نشان مثلاً موٹر، سائیکل، ریل گاڑی وغیرہ بنا دینا چاہئے تاکہ ان پڑھ ووٹر بھی مطلوبہ بکس کو بآسانی پہچان سکیں۔

(۷) پولنگ سٹیشن سے ایک ایک فرلانگ کے اندر کسی پارٹی یا اُمیدوار کو نہ کیمپ لگانے کی اجازت ہو اور نہ کسی کے حق میں یا خلاف کوئی کنویسنگ کرنے کی۔

(۸) کوئی سرکاری ملازم جب پولنگ سٹیشن پر کسی حیثیت سے مامور ہو، اگر کسی ووٹر کے آزادانہ استعمال رائے میں مداخلت کرے یا انتخابی ضابطے کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرے یا اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے سے دانستہ پہلو تہی کرے جس کا فائدہ لازماً کسی خاص اُمیدوار یا پارٹی کو پہنچتا ہو تو اس کے خلاف متعلقہ پارٹی، اُمیدوار یا ووٹر کو عدالت میں براہِ راست استغاثہ دائر کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

(۹) ووٹروں کو لانے کے لئے سواری کا استعمال فوجداری جرم قابلِ دست اندازی پولیس ہونا چاہئے وہ پریذائیڈنگ آفیسر کو پولنگ سٹیشن کے حدود میں ان تمام بے قاعدگیوں کے روکنے کے پورے اختیارات ہونے چاہئیں جن کو قانون میں جرم یا بے قاعدگی قرار دیا گیا ہے۔

(۱۱) پولنگ شروع ہونے کے وقت بکسوں پر امیدواروں کی اپنی مُہریں بھی ہونی چاہئیں اور پولنگ کے دوران میں ایک گھنٹے کی چھٹی کے وقت تمام بکس پولنگ ایجنٹوں کے سامنے رہنے چاہئیں اور پولیس کا اُن پر پہرہ رہنا چاہیئے۔

(۱۲) پولنگ بوتھ میں بکسوں کا نگران لازماً حلقہ انتخاب سے باہر کا کوئی آدمی ہونا چاہیئے، جو نہ اس حلقہ کا رہنے والا ہو اور نہ اس حلقہ میں ملازم ہو۔ نیز یہ کہ نگراں کو سرکاری وردی میں نہ ہونا چاہیئے۔

(۱۳) انتخابی عذرداری کے لئے ٹریبونل کا تقرر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے سپرد ہونا چاہیئے۔ ٹریبونل کے فیصلے کی حیثیت سفارش کی نہیں بلکہ عدالتی فیصلے کی ہونی چاہیئے اور ایک میعاد مقرر ہونی چاہیئے جس کے اندر اندر انتخابی عذرداریوں کا فیصلہ ہونا لازمی ہو۔

(۱۴) حکومت نے اگر قواعد انتخابات کے مطابق عمل کرنے میں غفلت یا جانبداری سے کام لیا ہو تو اس کے خلاف ہائیکورٹ میں دعویٰ دائر کرنے کی گنجائش ہونی چاہیئے۔

(۱۵) عورتوں کے لئے پولنگ کا ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ پولنگ سٹیشن پر مرد موجود نہ ہوں تاکہ خواتین کارکن آزادی سے کام کر سکیں اور ووٹ ڈالنے والی خواتین بھی بے نقاب ہو سکیں۔

۴۔ انتخابی قوانین سے عوام کو واقف کرانے کی ضرورت

مجلس شوریٰ نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ انتخابات کے معاملہ میں ملک کے موجودہ قوانین سے عوام کی ناواقفیت بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ آئندہ ہر انتخابی جدوجہد کے موقع پر جماعت کے کارکن وسیع پیمانے پر عوام کو انتخابی قواعد سے آگاہ کرنے کی کوشش کریں۔

۵۔ انتخابات میں عورتوں کے حصہ لینے کا مسئلہ

جہاں تک عورتوں کے لئے حق رائے دہندگی کا تعلق ہے اس مسئلے میں جماعت اسلامی کے اہل علم کے درمیان بھی اتفاق نہیں ہے اور ہندوستان اور پاکستان اور دوسرے ممالک اسلامیہ کے علماء بھی

کسی متفق علیہ فیصلے پر نہیں پہنچ سکے ہیں کہ اسلام کے سیاسی نظام میں عورتوں کو حق رائے دہندگی حاصل ہے یا نہیں۔ اس لئے مجلس شوریٰ نے اس مسئلے کی اصولی حیثیت سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف مصالح وقت کے لحاظ سے اس پر غور کیا ہے اور بالاتفاق اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ موجودہ حالات میں ہر بالغ عورت کو حق رائے دہندگی دینا اس سے بھی زیادہ نقصان دہ ہے جو ہر بالغ مرد کو یہ حق دینے سے پہنچنے کا امکان ہے۔ پنجاب کے تازہ انتخابی تجربے کے بعد مجلس شوریٰ اپنی اس رائے میں اور بھی زیادہ پختہ ہوگئی ہے اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں:۔

اولاً ہمارے مرد عوام کی بہ نسبت ہماری عورتیں زیادہ جہالت میں مبتلا ہیں اور ملک کے معاملات میں آزادانہ رائے قائم کرنے کی بہت کم اہلیت رکھتی ہیں۔ ان کی رائے زیادہ تر مردوں کی رائے کے تابع ہے اور ان کی رائے دہندگی کے معنی صرف مرد آبادی کی قوت رائے دہی (VOTING STRENGTH) میں اضافہ کرنے کے ہیں۔

ثانیاً عورتوں کو مردوں کی بہ نسبت زیادہ آسانی سے دھوکا دیا جا سکتا ہے، مرعوب کیا جا سکتا ہے اور ان کے پولنگ سٹیشنوں پر زیادہ آزادی کے ساتھ دھاندلیاں کی جا سکتی ہیں۔

ثالثاً موجودہ حالات میں عورتوں کے عام حق رائے دہی کی حیثیت صرف سیاسی ہی نہیں ہے بلکہ معاشرتی بھی ہے، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس چیز کو مسلمان عورتوں میں بے پردگی اور بے حیائی کی اشاعت کا وسیع پیمانے پر ایک مؤثر ذریعہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

رابعاً پنجاب میں سیاسی پارٹیوں نے ووٹ حاصل کرنے کے لئے جو ہتھکنڈے استعمال کئے اور حکام نے جس طرح اس معاملہ میں کھلی کھلی مداخلت کی، اس کو دیکھتے ہوئے ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ مردوں کی قوت رائے دہی کی بہ نسبت عورتوں کی قوت رائے دہی سے اور بھی زیادہ ناجائز فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور سیاسی پارٹیوں کے ہاتھ میں اس حربے کا رہنا صرف ہمارے ملک کے سیاسی نظام ہی کے لئے نہیں بلکہ ہماری پوری قومی زندگی کے لئے گہری اور دور رس خرابیوں کا موجب ہے۔

ان وجوہ سے جماعت اسلامی پاکستان کی مجلس شوریٰ یہ قطعی رائے رکھتی ہے کہ اگر اسلام میں عورتوں

گو اصولاً یہ حق حاصل ہے بھی تو اسے اُس وقت تک ملتوی رہنا چاہیے جب تک ہماری قومی زندگی کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہ آجائیں جو حدود شرعیہ کے پابند ہوں اور اپنی قوم کے عوام کی ذہنی و اخلاقی پستی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے بجائے ان کی تربیت اور اصلاح کی فکر رکھتے ہوں۔

لیکن مجلس شوریٰ کو یہ توقع نہیں ہے کہ جن لوگوں نے خوب سوچ سمجھ کر اس موقع پر عورتوں کو عام حق رائے دہی دیا ہے وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں گے۔ بظاہر اندیشہ یہی ہے کہ یہاں اب یہ طریقہ جاری ہی رہے گا۔ اس لئے مجلس شوریٰ نے معاملے کے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ اگر یہ طریقہ جاری رہے تو ہمارے لئے صحیح پالیسی کیا ہے؟ مجلس شوریٰ کو ان لوگوں کی رائے سے اتفاق نہیں ہے جو اس صورتِ حال میں عورتوں کی حد تک انتخابات سے مقاطعے کا مشورہ دیتے ہیں، کیونکہ اس صورت میں آئینی ذرائع سے تبدیلی قیادت کا قریب قریب کوئی امکان نہیں رہتا۔ لہٰذا مجلس شوریٰ مقاطعہ کے بجائے حسب ذیل طریق کار تجویز کرتی ہے:-

(۱) عورتوں کی ذہنی تربیت، اخلاقی اصلاح، اور اجتماعی تنظیم کا کام پوری تیزی کے ساتھ اور وسیع پیمانے پر شروع کر دیا جائے۔ اس کے لئے طریق کار وہی ہوگا جو آگے تجویز نمبر۵ میں بیان کیا جا رہا ہے۔ اس طریقے کے مطابق عورتوں کے حلقہ ہائے متفقین کثرت سے منظم کئے جائیں اور ان میں سے بہتر کارکن خواتین کو جماعت کی رکنیت کے دائرے میں لینے کی کوشش کی جائے۔

(۲) زنانہ حلقہ ہائے متفقین کے اجتماعات میں ایسا پروگرام رکھا جائے جس سے نہ صرف یہ کہ عورتوں کی دینی معلومات بڑھیں اور ان کی اخلاقی اصلاح ہو، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کو ملک کے نظم و نسق اور سیاسی معاملات کے متعلق واقفیت بھی بہم پہنچائی جائے اور انھیں اس قابل بنایا جائے کہ وہ ان معاملات میں صحیح رائے قائم کر سکیں۔ نیز پڑھی لکھی خواتین کو مطالعہ کا شوق بھی دلایا جائے اور ان کے اندر اخبار بینی کا ذوق بھی پیدا کیا جائے۔

(۳) آئندہ سے تمام مقامی جماعتیں اپنی رپورٹوں میں بالالتزام یہ بھی بتاتی رہیں کہ زنانہ حلقوں کی تنظیم کس رفتار سے ہو رہی ہے اور ان حلقوں میں کیا کام ہو رہا ہے۔

(۴) انتخابات کے موقع پر کوشش کی جائے کہ عورتوں کو انتخاب کے طریق کار اور قانون کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچائی جائیں اور جہاں تک ممکن ہو عملاً پولنگ کی ریہرسل (REHEARSAL) بھی کرا دیا جائے۔

(۵) خواتین کارکنوں میں یہ صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے پوری خود اعتمادی اور جرأت کے ساتھ انتخابی جنگ میں حصہ لے سکیں، کسی بے قاعدگی کو نہ چلنے دیں اور کسی سے مرعوب نہ ہو سکیں۔

(۶) ہر انتخاب کے موقع پر جب خواتین کارکنوں کو کسی پولنگ سٹیشن پر مامور کیا جائے تو ان کی مدد اور حفاظت کے لئے جماعت کے مرد کارکن کافی تعداد میں پولنگ سٹیشن سے باہر مامور کئے جائیں۔

(۷) ہر انتخاب کے موقع پر ہر زنانہ پولنگ سٹیشن کے گردوپیش کی شریف آبادی سے اپیل کی جائے کہ وہ غنڈہ گردی سے خواتین کی حفاظت کے لئے ہمارے کارکنوں سے تعاون کریں۔ نیز سیاسی پارٹیوں کے کارکنوں اور آزاد امیدواروں کے حامیوں سے بھی اپیل کی جائے کہ اپنی عارضی کامیابیوں کی خاطر پوری قوم کے اخلاق کو تباہ کرنے سے باز آئیں۔

۶- جماعت کے انتخابی کام کی خرابیوں کا جائزہ اور ان کی اصلاح

پنجاب کے پچھلے انتخابات میں جماعت کے کارکنوں نے جن ۲۴ حلقوں میں انتخابی کام کیا ہے مجلس شوریٰ نے ان تمام حلقوں کے کام کا فرداً فرداً اس نقطۂ نظر سے جائزہ لیا کہ ان میں ہمارے کارکنوں کا اخلاقی رویہ کیسا رہا ہے اور انہوں نے قانون اور ضابطے کی کس حد تک پابندی کی ہے۔ اس سلسلے میں ان تمام شکایات کی بھی تحقیقات کی گئی جو جماعت کے اندر یا باہر سے مرکزی دفتر میں پہنچی تھیں۔ اس جائزے سے یہ معلوم ہوا کہ صرف دو حلقے ایسے ہیں جن میں غیر اخلاقی کارروائیاں اور بے ضابطہ حرکات زیادہ وسیع پیمانے پر ہوئی ہیں اور یہ دونوں حلقے وہ ہیں جن میں انتخابی تنظیم کا ذمہ جماعت نے براہ راست نہیں لیا تھا بلکہ جنہیں بے ضابطہ حلقوں کی حیثیت سے قبول کیا گیا تھا۔ ان دونوں حلقوں

کے بارے میں مجلس شوریٰ نے امیرِ جماعت کو مشورہ دیا ہے کہ جماعت اسلامی کے جن کارکنوں نے ان حلقوں کو منظور کرنے کی سفارش کی اور پھر نار وا کارروائیوں کو روکنے میں ناکام رہے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔

اس کے علاوہ چار حلقے ایسے ہیں جو براہِ راست جماعت کے چارج میں تھے اور وہاں جماعت کے بعض کارکنوں نے یا تو خود خلاف اخلاق اور خلاف ضابطہ کارروائیاں کیں یا اپنے حامیوں کو ان کے ارتکاب سے روکنے میں کوتاہی برتی۔ ایسے کارکنوں کے خلاف بھی تادیبی کارروائی کرنے کا امیرِ جماعت کو مشورہ دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ مجلس شوریٰ نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ ہر انتخاب کے موقع پر یہ بات نہ صرف کارکنانِ جماعت پر بلکہ جماعت کی حمایت میں جو لوگ کام کریں ان پر بھی اچھی طرح واضح کر دی جائے کہ جماعتِ اسلامی انتخاب میں کسی نشست کو جیتنے کی بہ نسبت زیادہ اور بدرجہا زیادہ اہمیت اس امر کو دیتی ہے کہ انتخابات کو بداخلاقیوں اور بے ضابطگیوں سے پاک کیا جائے اور انتخابی جنگ میں اخلاقی حدود اور قانون وضابطے کی پوری پوری پابندی کا نمونہ پیش کیا جائے۔ کیونکہ سیاست کو صداقت اور دیانت پر قائم کرنا جماعت اسلامی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے اور اس مقصد کو ہم کسی بڑے سے بڑے وقتی فائدے پر بھی قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس بنا پر مجلسِ شوریٰ نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ کسی ایسے رکنِ جماعت کو ہرگز معاف نہ کیا جائے جو کبھی انتخابی جدوجہد میں اخلاق اور ضابطے کے حدود سے تجاوز کرے۔ اور جماعت کے باہر کے جن لوگوں سے اس طرح کی حرکات کا صدور ہو آئندہ کے لئے ان کا تعاون قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے۔

۷- انتخابی عُذرداریوں کا مسئلہ

مجلس شوریٰ نے انتخابی عذرداریاں داخل کرنے کے مسئلہ پر بھی غور کیا۔ جہاں تک اُن اہم حلقوں کا تعلق ہے جن میں جماعت اسلامی نے شکست کھائی ہے یہ مجلس اپنے ذاتی علم، تجربے اور قوی شہادتوں کی بنا پر یہ رائے رکھتی ہے کہ ان میں کوئی ایک حلقہ بھی ایسا نہیں ہے جس کے انتخاب کو

ناجائز ثابت نہ کیا جا سکتا ہو۔ اگر کوئی غیر جانبدار کمیشن تحقیقات کے لئے مقرر کیا جائے تو اس کے سامنے پیش کرنے کے لئے ہمارے پاس ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے ان پورے اکتالیس حلقوں کے انتخاب کو سراسر غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بحالت موجودہ مجلس شوریٰ انتخابی عذرداریاں داخل کرنے کو اس لئے لاحاصل سمجھتی ہے کہ

اولاً یہاں الیکشن ٹربیونل جس طریقے سے بنایا جاتا ہے اور جس طرح اس کی کارروائیاں ہوتی ہیں، اور جو حیثیت اس کے فیصلوں کو دی گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی انتخابی عذرداری مشکل ہی سے مفید نتیجہ پیدا کر سکتی ہے۔

ثانیاً اس کے مصارف اتنے زیادہ ہیں کہ جماعت کے موجودہ مالی ذرائع ان کا مالی بار اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

ثالثاً اگر کوئی انتخابی عذرداری کامیاب بھی ہو جائے تو اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ ضمنی انتخاب میں ان تمام خرابیوں کا اعادہ نہ ہو سکے جن کی بنا پر پچھلے انتخاب کو ناجائز ٹھیرایا گیا ہو۔

ان وجوہ سے انتخابی عذرداری داخل کرنے کو بطور پالیسی کے تو مجلس شوریٰ پسند نہیں کرتی۔ البتہ اگر کسی حلقۂ انتخاب کے مخصوص حالات اس بات کے متقاضی ہوں تو امیر جماعت مرکزی الیکشن بورڈ کے مشورے سے اس کی اجازت دے سکتے ہیں۔

۸۔ ضمنی انتخابات کا مسئلہ

پنجاب میں عام انتخابات کے بعد جو نشستیں خالی ہوئی ہیں ان کے بارے میں مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کے ضمنی انتخاب میں کوئی حصہ نہ لیا جائے۔ کیونکہ ان حلقوں میں جن وجوہ سے ہمیں ناکامی ہوئی ہے وہ وجوہ بدستور باقی ہیں، نہ عوام کی ذہنی و اخلاقی حالت میں کوئی تغیر واقع ہوا ہے اور نہ سیاسی پارٹیوں اور سرکاری حکام ہی کے رویے میں کسی تغیر کا امکان نظر آتا ہے۔

۹۔ لوکل باڈیز کے انتخاب کا مسئلہ

میونسپل کمیٹیوں، کارپوریشنوں، اور دوسری لوکل باڈیز کے انتخابات کے بارے میں مجلس شوریٰ کی

رائے یہ ہے کہ جہاں کہیں اس کی نوبت آئے مقامی جماعتیں خود اس بارے میں رائے قائم کریں کہ آیا وہ وہاں انتخابات میں حصہ لے سکتی ہیں یا نہیں اور اگر لے سکتی ہیں تو کس حد تک ؟ اگر وہ حصہ لینا چاہیں تو مقامی حالات، اپنی طاقت، اور اپنے مجوزہ طریق کار کے متعلق ضروری معلومات مرکز میں بھیجکر ہدایات حاصل کریں۔

۱۰- پنچایتی نظام کی تشکیل جدید

پنجاب میں پنچایتی طریقے پر جدوجہد کے پہلے تجربے سے اس طریق کار میں جو نقائص پائے گئے ہیں ان کا پورا جائزہ لینے کے بعد مجلس شوریٰ پنچایتی نظام کی تشکیل جدید کے لئے یہ تجویز کرتی ہے کہ آئندہ جہاں کہیں انتخابی جدوجہد شروع کی جائے وہاں حسب ذیل طریق کار اختیار کیا جائے۔

(۱) اس پورے علاقے میں جہاں انتخابات منعقد ہونے والے ہوں جگہ جگہ وسیع پیمانے پر لٹریچر، تقریروں اور انفرادی ملاقاتوں کے ذریعہ سے جماعت کے مقصد، طریق انتخاب اور منشور کی تشریح کی جائے اور لوگوں کو اس کی طرف عام دعوت دی جائے

(۲) جو لوگ اس دعوت کو قبول کریں ان کے سامنے حلقہ متفقین جماعت اسلامی (جس کا دوسرا نام اسلامی پنچایت بھی ہوگا) کی رکنیت کا ترمیم شدہ عہدنامہ (جس کا نمونہ اس قرارداد کے آخر میں بطور ضمیمہ درج کیا جارہا ہے) پیش کیا جائے اور انہیں اس عہد کی ذمہ داریاں اچھی طرح سمجھا کر اس پر ان سے دستخط لئے جائیں۔

(۳) جس محلے یا بستی یا گاؤں میں کم از کم ۵ آدمی متفقین کے عہدنامے پر دستخط کر چکے ہوں وہاں ان کا حلقہ باقاعدہ منظم کر دیا جائے اور اگر وہاں کچھ ہمدرد اور متفقین پہلے سے موجود ہوں تو ان کو بھی اسی طریقے سے اس حلقے میں شامل کر لیا جائے۔ جماعت اسلامی کے مقامی ارکان اپنے محلے بستی یا گاؤں کے حلقہ متفقین کے آپ سے آپ (EX[illegible]) ممبر ہوں گے۔

(۴) حلقہ ہائے متفقین کے ارکان کو ترغیب دی جائے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو، اپنے حلقے کو وسیع کرنے کی کوشش کریں اور جس قدر ممکن ہو اپنے حلقہ میں جماعت کا لٹریچر فراہم کر کے خود پڑھیں اور دوسروں

کو پڑھوائیں۔

(۵) جو لوگ حلقۂ متفقین کے عہد نامہ پر دستخط کرنے سے گریز کریں ان کے سامنے ووٹر کا عہد نامہ پیش کیا جائے اور اگر وہ اس کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اس پر دستخط کرنے کے لئے آمادہ ہوں تو ان سے دستخط کے لئے جائیں۔ مگر ان پر یہ واضح کر دیا جائے کہ محض ووٹر کے عہد نامہ پر دستخط کرنے سے وہ اسلامی پنچایت کے رکن نہیں بن جائیں گے اور نہ اپنے حلقے کا نمائندہ نامزد کرنے میں ان کی رائے کا کوئی دخل ہو سکے گا۔ بلکہ اس عہد نامہ پر دستخط کرنے کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ اپنا ووٹ صحیح طریقے سے استعمال کرنے کا عہد کر رہے ہیں اور اگر اسلامی پنچایت اُن کے حلقے کے لئے کوئی ایسا نمائندہ نامزد کرے جسے وہ خود بھی ایمانداری کے ساتھ صالح اور اہل سمجھتے ہوں تو وہ اسے ووٹ دینے کے دیانۃً پابند ہوں گے۔

(۶) ایک تھانہ کے علاقے میں جتنے حلقہ ہائے متفقین ہیں ان سے ایک ایک دو دو نمائندے لے کر (جن کی تعداد کا انحصار ہر حلقے کے ارکان کی تعداد پر ہوگا) تھانے کی مرکزی پنچایت بنا دی جائے گی۔ انتخابی اغراض کے لئے ایک حلقۂ انتخاب کی مرکزی پنچایت اُن تھانوں کی مرکزی پنچایتوں یا ان کے نمائندوں کو ملا کر بنائی جائے گی جو اس حلقۂ انتخاب میں واقع ہوں۔ جماعت اسلامی کے جو ارکان کسی تھانے کے علاقے میں آباد ہوں وہ اس تھانے کی مرکزی پنچایت کے اور انتخابات کے موقع پر اس حلقۂ انتخاب کی مرکزی پنچایت کے آپ سے آپ رکن ہوں گے۔

(۷) جس انتخابی حلقے کی کم از کم ایک تہائی بستیوں میں حلقہ ہائے متفقین قائم ہو چکے ہوں اور جہاں کی کل رائے دہندہ آبادی کا کم از کم ۵ فیصدی حصہ ووٹر کے عہد نامہ پر دستخط کر چکا ہو، صرف اس کے بارے میں یہ غور کیا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی وہاں انتخابی جدوجہد کرنا منظور کرے۔ لیکن اس کا آخری فیصلہ کرنے میں حسب ذیل امور کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوگا۔

(ا) یہ کہ اس حلقۂ انتخاب کی مرکزی پنچایت نے خود اس خواہش کا اظہار کیا ہو اور اس اظہار کے ساتھ انتخابی جدوجہد کے لئے اپنا عملی تعاون بھی پیش کیا ہو۔

(ب) اس حلقۂ انتخاب میں جماعت کے کم از کم تین رکن اور کم از کم دس سرگرم کارکن متفقین موجود ہوں۔

(ج) اس حلقۂ انتخاب کی مرکزی پنچایت نے یہ ذمہ لیا ہو کہ وہ اپنے حلقے کی انتخابی جدوجہد کا کم از کم

۳/۴ خرچ خود فراہم کرے گی۔

(۸) ایک صوبے کے جتنے انتخابی حلقے اس طور پر تیار ہو چکے ہوں ان کے حالات کا جائزہ لینے اور پوری طرح اپنا اطمینان کر لینے کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کا مرکزی الیکشن بورڈ یہ فیصلہ کریگا کہ کتنے حلقوں اور کن حلقوں میں انتخابی جدوجہد کی ذمہ داری قبول کی جائے۔ مگر یہ فیصلہ فہرست رائے دہندگان کی اشاعت کے بعد سے حد ایک مہینے کے اندر ہو جانا چاہئے۔ اور جماعت کے ذمہ دار کارکنوں کا یہ فرض ہے کہ مرکزی الیکشن بورڈ کو تمام ضروری معلومات بہم پہنچا دیں۔

نوٹ:- یہاں جماعت کے ذمہ دار کارکنوں سے مراد جماعت کے انتظامی حلقوں کے امراء ہیں۔ وہ یہ معلومات اپنی مجالس شوریٰ کے ارکان کی مدد اور مشورے سے فراہم کر کے مرکزی الیکشن بورڈ کو بھیجیں گے۔ مختلف حلقہ ہائے انتخاب کے ناظمین اور دوسرے کارکن جو معلومات الیکشن بورڈ تک پہنچانا ضروری سمجھتے ہوں اپنے حلقہ کے امیر یا ارکان شوریٰ تک پہنچا سکتے ہیں۔ اگر وہ اس بارے میں اُن سے بالا بالا کوئی کارروائی کرنے کرانے کی کوشش کریں گے تو ان کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی جائے گی۔

(۹) مرکزی الیکشن بورڈ جن حلقوں میں انتخابی جدوجہد کی ذمہ داری قبول کرنے کا فیصلہ کرے۔ ان میں متفقین کی بھرتی، حلقہ ہائے متفقین کی تنظیم اور ووٹر کے عہد نامے پُر کروانے اور نئے حلقہ ہائے متفقین سے مرکزی پنچایت کے لئے نمائندے لینے کی مہم پوری قوت کے ساتھ شروع کر دی جائے۔

(۱۰) کوشش کی جائے کہ ہر حلقۂ انتخاب میں کاغذات نامزدگی کے داخلہ کی تاریخ سے پہلے مرکزی پنچایت کے دو تین اجلاس ہو جائیں تاکہ تمام شرکاء پنچایت اچھی طرح ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں۔ انتخاب سے متعلق جملہ مسائل کو بھی اچھی طرح سمجھ لیں اور اپنے حلقہ کی نمائندگی کے لئے موزوں اشخاص بھی خوب سوچ سمجھ کر تجویز کر سکیں۔

مرکزی پنچایت کے پہلے ہی اجلاس میں یہ بات واضح کر دی جائے کہ اپنے علاقے کی پوری جدوجہد مالی اور کوشش دونوں کے لحاظ سے ان کو خود ہی کرنی ہے۔ علاقے سے باہر کی امداد کے بھروسہ پر

کوئی کام نہیں کرنا ہے۔

(۱) مرکزی پنچایت میں جن لوگوں کے نام اپنے حلقۂ انتخاب کی نمائندگی کے لئے پیش کئے جائیں اُن میں سے جن کے نام پنچایت کے حاضر ارکان کی اکثریت نے تجویز کئے ہوں اُن کے نام چھانٹ لئے جائیں۔ پھر ان ناموں پر پنچایت کے ایک مجموعی اجلاس میں غور کیا جائے اور جن کو زیادہ سے زیادہ ارکانِ پنچایت کی پسندیدگی حاصل ہو ان کے نام جماعت اسلامی پاکستان کے مرکزی الیکشن بورڈ کو بھیج دیئے جائیں۔ اس کے ساتھ ان اشخاص کی سیرت، اخلاق، دینی حالت، علمی قابلیت، اور سابق زندگی کے متعلق وہ تمام ضروری معلومات بھی بھیجی جائیں جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے میں مددگار ہو سکیں۔

(۲) مرکزی الیکشن بورڈ ان ناموں پر غور کر کے آخری فیصلہ دے کہ ان میں سے کون اصلح اور اہل تر ہے جس کے کاغذات نامزدگی داخل کئے جائیں۔

اگر مرکزی پنچایت نے کسی ایک ہی شخص کو بالاتفاق تجویز کیا ہو تو مرکزی الیکشن بورڈ یا تو اسے منظور کرے یا اعتراض ہونے کی صورت میں اپنے وجوہ اعتراض واضح طور پر بتلائے اور مرکزی پنچایت سے درخواست کرے کہ وہ ان اعتراضات کی روشنی میں اپنے فیصلے پر دوبارہ غور کرے۔ بہرحال کوشش کی جائے کہ جس شخص کو بالآخر نامزد کیا جائے اس کے بارے میں حلقے کی مرکزی پنچایت اور جماعت اسلامی کے مرکزی الیکشن بورڈ دونوں کو پورا اطمینان حاصل ہو۔

(۳) ایک سے زائد حلقوں سے ایک ہی شخص کے نامزد ہو جانے کی صورت میں الیکشن بورڈ اس وقت تک نامزدگی کی منظوری نہیں دیگا جب تک کہ متعلقہ پنچایتوں پر یہ بات واضح نہ کر دی جائے کہ ایک سے زیادہ حلقوں سے کامیابی کی صورت میں نمائندہ بہرحال ایک ہی حلقے کی نمائندگی کر سکے گا اور باقی حلقوں سے اسے استعفا دینا پڑے گا۔

(۴) ہر جگہ جہاں حلقۂ متفقین قائم ہو اس کے نظام کے ساتھ ہی اس کا بیت المال بھی قائم ہو جانا چاہیے اور حلقے کے متفقین کی اعانت، زکوٰۃ اور صدقات کی رقوم اس بیت المال میں جمع اور اس کے ذریعہ سے صرف ہونی چاہئیں۔ مگر ارکانِ جماعت اسلامی اس سے مستثنیٰ ہونگے کیونکہ ان کی رقمیں جماعت کے بیت المال میں داخل ہونگی۔

نوٹ :- حلقہ ہائے متفقین کے بیت المالوں کے لئے الگ رسیدیں چھپوائی جائیں گی اور ان کا انتظام جماعت کے تنظیمی حلقوں کے امراء اپنے اپنے حلقوں کی ضرورت کے مطابق خود کریں گے۔

نمونہ عہدنامہ حلقہ متفقین جماعت اسلامی پاکستان

مذکورہ شق ۲ بالا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حلقۂ متفقین جماعت اسلامی پاکستان

(اسلامی پنچایت)

میں اللہ رب العالمین کو گواہ کر کے اقرار کرتا ہوں / کرتی ہوں کہ

(۱) میری دلی خواہش یہ ہے کہ پاکستان میں پورا اسلام پوری طرح قائم ہو۔

(۲) اس مقصد کے لئے مجھے جماعت اسلامی کے پروگرام، منشور اور طریقۂ انتخاب سے پورا اتفاق ہے

(۳) اس کام میں، جہاں تک میرے بس میں ہوگا، میں جماعت کا ساتھ دوں گا / دوں گی۔

(۴) میں انشاء اللہ خود بھی دینی فرائض کو ادا کرنے اور اپنی زندگی کو اسلام کے مطابق بنانے کی کوشش کروں گا / کروں گی اور دوسروں کو بھی اس کی نصیحت کرتا رہوں گا / کرتی رہوں گی۔

اللہ تعالیٰ مجھے اس عہد کو وفا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

دستخط یا نشان انگوٹھا ....

(نوٹ، متفقین کے عہدنامہ کے یہ فارم سندھ اور کراچی کیلئے کراچی کی جماعت شائع کریگی۔ باقی سارے ملک کیلئے یہ فارم مرکز سے شائع کئے جائیں گے)

اا پنچایتی نظام کا مستقل پروگرام

مجلس شوریٰ کی تجویز ہے کہ انتخابی کام کے علاوہ اس پنچایتی نظام کو عوام کی اصلاح اور دعوت اسلامی کی توسیع کے لئے ایک مستقل ذریعہ بھی بنایا جائے۔ اس غرض کے لئے جماعت اسلامی کے کارکنوں کو ہر جگہ جہاں بھی وہ ہوں حلقہ ہائے متفقین کی تنظیم کا سلسلہ پوری طاقت کے ساتھ شروع کر دینا چاہئے خواہ وہاں انتخابی کام درپیش ہو یا نہ ہو۔ پچھلے جہاں جہاں بھی حلقہ ہائے ہمدرداں بنتے رہے تھے اُن کو

قرارداد وعملا کے مطابق نئے حلقہ ہائے متفقین میں تبدیل کر دیا جائے۔ پہلے جن لوگوں نے حلقۂ متفقین کے پرانے عہدنامے پر دستخط کئے تھے ان کے سامنے نیا ترمیم شدہ عہدنامہ پیش کیا جائے اور اگر وہ نئے حلقہ ہائے متفقین میں شامل ہونے کے لئے تیار ہوں تو ان سے جدید عہدنامۂ متفقین پر دستخط لیے جائیں۔ اسی طرح پنجاب میں جہاں جہاں انتخابی اغراض کے لئے پنچایتیں بنائی گئی تھیں وہاں ان پنچایتوں کے ارکان کو حلقہ ہائے متفقین کی تنظیم میں لانے کی کوشش کی جائے۔ جن لوگوں نے ووٹروں کے عہدنامے پر دستخط کئے تھے یا جن کے متعلق معلوم ہے کہ انہوں نے پچھلے انتخاب میں ہمارے ساتھ ووٹ دیئے ہیں ان کو بھی اس تنظیم میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے۔

ان حلقہ ہائے متفقین اسلامی پنچایتوں کیلئے مستقل پروگرام یہ ہوگا کہ اجتماعی اور معاشرتی اصلاح کے لئے کوشش کریں مثلاً

(۱) اپنی بستی کی مسجدوں کی اصلاحِ حال۔

(۲) عوام میں علم دین پھیلانا۔

(۳) عام طور پر لوگوں کو ظلم و ستم سے بچانا اور خصوصاً ان لوگوں کو جنہوں نے پچھلے انتخابات میں جماعتِ اسلامی کا ساتھ دیا ہے۔

(۴) قصبات اور دیہات میں دارالمطالعوں کا قیام۔

(۵) ایسے پرائمری سکول اور ہائی سکول اور مذہبی تعلیم کے مدرسے قائم کرنا جن میں تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت کی بھی کوشش کی جائے۔

(۶) تعلیمِ بالغاں کا انتظام۔

(۷) بستی کے عام لوگوں کے تعاون سے صفائی اور حفظانِ صحت کی کوشش۔

(۸) بستی کے یتیموں، بیواؤں، معذوروں اور غریب طالب علموں کی فہرستیں تیار کرنا اور جن جن ذرائع سے ممکن ہو ان کی مدد کا انتظام کرنا۔ وغیرہ۔

۱۲۔ کارکنوں کی اخلاقی، روحانی اور ذہنی تربیت کا پروگرام

مجلس شوریٰ یہ محسوس کرتی ہے کہ تحریک اسلامی اب جس شدید جد و جہد کے مرحلے میں داخل ہوئی ہے

اس میں ہمارے کارکنوں کی اخلاقی، روحانی اور مذہبی تربیت نہایت ضروری ہے۔ اس غرض کے لئے حسبِ ذیل پروگرام تجویز کیا گیا ہے:

(۱) جہاں کہیں جماعت میں کوئی عالمِ دین موجود ہے وہاں درسِ قرآن و حدیث کا سلسلہ شروع کر دیا جائے اور ارکان پر لازم کیا جائے کہ وہ اس درس میں شریک ہوں نیز متفقین کو بھی ترغیب دی جائے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

(۲) جہاں کوئی اہل آدمی موجود نہیں ہے وہاں کسی مستند ترجمہ و تفسیر کا اجتماعی مطالعہ کیا جائے۔ اہلیت نہ رکھنے والے لوگوں نے اگر کہیں قرآن اور حدیث کا درس شروع کر رکھا ہو تو اسے لازماً بند کر دیا جائے اور صرف اس اجتماعی مطالعہ پر اکتفا کیا جائے۔

(۳) جماعت کے ہر تنظیمی حلقے میں ایک تربیت گاہ قائم کی جائے جس کا نگران یا تو امیرِ حلقہ خود ہو یا حلقے کی مجلس شوریٰ کے مشورے سے کسی اہل آدمی کو مقرر کیا جائے۔ اس تربیت گاہ کا کورس پندرہ دن سے زیادہ کا نہ رکھا جائے اور کوشش کی جائے کہ ایک سال کے اندر اندر حلقے کے تمام نئے اور پرانے ارکان اس سے گزر جائیں۔ ارکان کا اس تربیت گاہ میں آنا تو لازمی ہونا چاہیے لیکن ان کی شرکت کی تاریخیں متعین کرنے میں ان کی زیادہ سے زیادہ سہولت کو مدنظر رکھا جائے۔ ارکان کے علاوہ حلقہ ہائے متفقین کے کارکنوں کو بھی ترغیب دی جائے کہ وہ بھی اس تربیت گاہ سے فائدہ اٹھائیں۔

تربیت کے نصاب میں جو چیزیں شامل ہونی چاہئیں وہ یہ ہیں۔

الف۔ قرآن مجید کی ایسی آیات کا مجموعہ جو اخلاقی اور روحانی تربیت کے لئے مناسب ترین ہوں۔ (اس مجموعے کی تیاری کا کام مولانا مسعود عالم صاحب کے سپرد کیا گیا ہے)۔

ب۔ ایسی احادیث کا مجموعہ جن میں دین کی روح اور عبادات کے مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہو، انفرادی اور اجتماعی اخلاق کے متعلق ہدایات دی گئی ہوں اور جماعتی زندگی کے آداب اور اصول بتائے گئے ہوں۔ (اس مجموعے کی تیاری کا کام مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے سپرد کیا گیا ہے)

ج۔ فقہی احکام کے متعلق کوئی ایسا مختصر رسالہ جس سے روزمرہ کی زندگی کے ضروری مسائل کے

متعلق آگاہی ہو جائے۔ (شائع شدہ فقہی لٹریچر میں سے کسی موزوں رسالے کا انتخاب مولانا عبدالحق صاحب، مولانا عبدالرحیم اشرف صاحب اور مولانا صدرالدین صاحب کے سپرد کیا گیا ہے)

د- جماعت کے لٹریچر کا ایسا خلاصہ جس سے جماعت اسلامی کی دعوت، اس کے طریق کار اور نظامِ جماعت کو اچھی طرح سمجھا جا سکے۔ (اس خلاصے کی تیاری کا کام ملک محمد سعید احمد صاحب کے سپرد کیا گیا ہے)

ہ- تربیت کے دوران میں نہ صرف نماز با جماعت کا اہتمام پوری پابندی سے کیا جائے بلکہ نماز تہجد بھی سب لوگ مل کر ادا کریں نیز اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ تربیتی پروگرام کے دوران میں گفتگو، نشست و برخاست اور جملہ حرکات و سکنات میں ہر طرح کے مکروہات سے پرہیز ہو اور ہر طرح آداب شرعی ملحوظ رکھے جائیں۔

نوٹ:- مذکورہ بالا مجموعوں کیلئے مواد چھانٹنے اور فقہی رسالہ کے انتخاب کا کام ایک ماہ کے اندر اندر یعنی مئی کے آخر تک مکمل ہو کر مرکز میں آجانا چاہئے تاکہ تربیت گاہ کا پروگرام رمضان کے بعد شروع کیا جاسکے۔

امراء حلقہ رمضان کے بعد تربیت گاہوں کے اجراء کے لئے انتظامات ابھی سے شروع کر دیں۔

س- مرکز اور مختلف مقامی جماعتوں کی طرف سے آیات قرآنی، احادیث اور جماعت کے لٹریچر کے اقتباسات کے جو چارٹ اور کتبے وقتاً فوقتاً شائع کئے جاتے رہے ہیں ان کی مدد سے اخلاقی، روحانی اور ذہنی تربیت کے لئے موزوں ترین کتبے منتخب کر کے خوبصورت طریقے سے شائع کر دیئے جائیں اور ان کو جماعت کے تمام دفاتر، تربیت گاہوں، دارالمطالعوں اور اجتماع گاہوں میں آویزاں کیا جائے اور ان کی عام اشاعت اور فروخت بھی کی جائے۔ اس کے لئے منیجر مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان کو ہدایت کر دی جائے۔

۱۳- تعلیم کا مسئلہ

ملک میں تعلیم کے انتظام کی ابتری اور خصوصیت کے ساتھ اخلاقی تربیت کے فقدان کی وجہ سے جماعت کے ارکان، متفقین اور عموماً صحیح الخیال مسلمانوں کو اپنی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے بارے میں جو پریشانیاں پیش آرہی ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے مجلس شوریٰ اب یہ مناسب سمجھتی ہے کہ

ا- جہاں جہاں بھی مقامی حالات سازگار ہوں اور مقامی جماعتیں اپنے ارکان اور متفقین کے تعاون سے

اس کا انتظام کر سکیں وہاں پرائمری اور ہائی سکول قائم کئے جائیں اور ان میں رائج الوقت نصاب کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا خاص اہتمام کیا جائے لیکن اس کے ساتھ یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ ایسے اداروں کا مالی بار جماعت کے مالیات پر نہ پڑے۔

۲-۱ اسی طرح لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے حلقہ ہائے خواتین زنانہ مدرسے قائم کرنے کی کوشش کریں لیکن اس بارے میں سردست مناسب یہ ہوگا کہ لڑکیوں کا ایک مرکزی مدرسہ شہر لاہور میں مرکز کی براہِ راست نگرانی و رہنمائی میں قائم کیا جائے[1] اور جب یہ مدرسہ اطمینان بخش طریق پر چلنے لگے تو اسی نمونہ پر دوسرے مقامات پر زنانہ مدرسے قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ مرکزی مدرسہ کا انتظام اور اس کے لئے وسائل کی فراہمی کا کام حلقہ خواتین شہر لاہور امیر جماعت کے مشورے اور رہنمائی سے کرے۔

۳- جناب محمد عبد الجبار غازی صاحب کو دوسرے سارے کاموں سے فارغ کرکے جماعت کے تجویز کردہ نظامِ تعلیم کے مطابق ایک معیاری درسگاہ کے قیام کے لئے مختص کر دیا جائے۔ جماعت کے اندر اور باہر جو لوگ اس درسگاہ کی ضرورت اور اہمیت کا احساس رکھتے ہیں ان کو چاہئے کہ اس کے لئے ضروری وسائل کی فراہمی میں غازی صاحب کا ہاتھ بٹائیں۔[2]

---

[1] سردست اس مرکزی مدرسے کا قیام بھی تجویز ہی کی حد تک ہے کیونکہ عملاً اس کی راہ میں بہت سی مشکلات حائل ہیں۔ ایک بڑی مشکل مدرسے کے لئے مناسب مکان کی ہے۔ بہرحال کوشش کی جا رہی ہے۔

[2] مجلس شوریٰ نے اس سلسلہ میں سردار محمد اجمل خاں صاحب کی اس پیشکش پر بھی غور کیا کہ یہ درسگاہ رحیم آباد (ریاست بہاولپور) میں قائم کی جائے تو اس کے سارے مصارف وہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ معاملہ کے سارے پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد مجلس اس نتیجے پر پہنچی کہ سردار صاحب کی اس پیشکش کو مختلف وجوہ سے قبول نہیں کیا جا سکتا جن میں سے ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جماعت کا کوئی مرکزی ادارہ ابتداءً ایک ریاست کے حدود کے اندر قائم کرنا مناسب نہیں ہے۔ سردار صاحب کے پیشِ نظر درسگاہ کو چلانے کے لئے مشورے اور رہنمائی کی نوعیت کی جتنی مدد ممکن ہو امیر جماعت اپنی صوابدید کے مطابق دیتے رہیں۔

۱۴- بیرون پاکستان میں تبلیغ و اشاعت

مجلس شوریٰ کی رائے میں یہ بھی ضروری ہے کہ

(۱) جتنے لوگ جماعت کے ارکان یا متفقین میں سے حج کے لئے جانے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ پہلے سے مرکز کو مطلع کر دیا کریں تاکہ ایسے سب لوگوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرا دیا جایا کرے اور اگر ان کا اجتماعی سفر ممکن نہ بھی ہو تو کم از کم زمانۂ حج میں وہ باہم مل سکیں اور ثواب زیارت کے ساتھ ساتھ تحریک اقامت دین کی توسیع کیلئے بھی کچھ کام کر سکیں۔

(۲) مجلس شوریٰ نے اپنے گذشتہ اجلاس میں جماعت کے تعارف کیلئے ایک دو ورقہ شائع کرنے کی جو ہدایت کی تھی اسے جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے تاکہ بیرونی ممالک کے لوگوں کو جماعت سے متعارف کرانے میں آسانی ہو۔

۱۵- جماعت کے نظام سے متعلق

مجلس شوریٰ نے جماعت کے موجودہ نظام کا بھی جائزہ لیا اور اس کے انتظامی قواعد میں سے بعض کو طویل عمل کا موجب اور بعض کو بدلے ہوئے حالات میں غیر ضروری خیال کرتے ہوئے ان میں حسب ذیل تبدیلیاں تجویز کیں۔

(۱) جبکہ امراء حلقہ اپنے حلقوں کی مفصل رپورٹیں ہر سہ ماہی اور سال کے اختتام پر مرکز میں بھیج دیتے ہیں تو حلقوں کے ماتحت ضلعی جماعتوں سے بھی رپورٹیں مرکز میں طلب کرنا غیر ضروری ہے اس لئے آئندہ مرکز میں صرف حلقوں سے رپورٹیں طلب کی جائیں اور ضلعی جماعتوں کی رپورٹیں صرف حلقے کے دفتر میں بھیجی جایا کریں۔

(۲) رپورٹوں کی ترتیب کے بارے میں موجودہ ہدایات بہت طویل اور پیچیدہ ہیں ان کو نظر ثانی کر کے از سر نو مرتب اور شائع کیا جائے۔

(۳) مقامی ضلعی اور حلقوں کے بیت المالوں کی رپورٹیں مرکز میں طلب کرنے کا قاعدہ بھی بند کر دیا جائے حلقے کے اندر انتظامی اور مالی سارے معاملات امیر حلقہ ہی سے متعلق ہونے چاہئیں اس لئے مقامی اور ضلعی بیت المالوں کی رپورٹیں صرف متعلقہ حلقے کے دفتر میں بھیجی جایا کریں۔ اور حلقے اپنے حسابات مرکز کو دیا کریں۔

(۴) تمام حلقوں میں بجٹ کا طریقہ رائج کیا جائے اور مرکز میں حلقہ کے بیت المال کی رپورٹ بھیجنے کے بجائے ہر سال سے شروع میں آئندہ سال کی متوقع آمدنی اور پیش نظر پروگرام اور منصوبوں کے جملہ مصارف کا مدوار زیادہ سے زیادہ صحیح تخمینہ تیار کر کے حلقے کی مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کیا جائے مجلس میں بحث و تمحیص کے بعد اسکی جو آخری صورت تجویز ہو اسے امیر جماعت اسلامی پاکستان کے پاس بھیجدیا جائے اور پھر ان کی رائے کی روشنی میں حلقہ کی مجلس شوریٰ بجٹ پر دوبارہ غور کر کے اس کا آخری فیصلہ کرے۔

مالی سال یکم اپریل سے ۳۱ مارچ متصور ہوگا۔ اور بجٹ کا طریقہ اسی سال سے شروع ہو جانا چاہئے۔ *

* ۵- مجلس شوریٰ نے اپنے گذشتہ اجلاس زکوٰۃ میں سہ ماہی فنڈ کو جماعت کی پالیسی و مزاج کے خلاف قرار دیتے ہوئے منسوخ کر دیا تھا۔ اس کی اطلاع تمام ارکان اور جماعتوں کو باقاعدہ کر دینی چاہئے۔

رسائل و مسائل

چند نئی موشگافیاں

سوال :۔

"خدا کے دین کی اشاعت کا جو کام اپنی توفیق کے مطابق ہم لوگ سرانجام دے رہے ہیں، اس کے پھیلنے میں آپ کی بعض کتابیں، مثلاً دینیات، خطبات وغیرہ بہت مدد دے رہی ہیں اور ان کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے۔

لیکن دوسری طرف یہ دیکھتے ہیں مخالفینِ اسلام کا خاص ہدف بھی بنی ہوئی ہیں۔ ان کی بعض عبارات کو چھانٹ چھانٹ کر غلط فہمی پھیلانے اور ہمیں بدنام کرنے کی مہم جاری ہے۔ یہاں تک کہ دنیا پرست مفتیانِ کرام ان عبارات کی بنیاد پر ہمارے خلاف فتوائے کفر تک جاری کر چکے ہیں۔ ان حالات میں گفتگوؤں کا محور تمام تر چند مخصوص عبارات بن گئی ہیں۔ یہ عبارات حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ رسالۂ دینیات باب چہارم کے آخر میں آپ نے لکھا ہے کہ "یہ پانچ عقیدے ہیں، جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے۔ ان پانچوں عقیدوں کا خلاصہ صرف ایک کلمہ میں آجاتا ہے۔" پھر باب پنجم میں درج ہے کہ "پچھلے باب میں تم کو بتایا گیا ہے کہ حضرت محمد صلعم نے پانچ امور پر ایمان لانے کی تعلیم دی ہے" حالانکہ حدیث صحیح میں "والقدر خیرہ وشرہ" کو ملا کر ایمان کو چھ چیزوں پر مشتمل قرار دیا گیا ہے [illegible] اس سے معترضین نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ "فرقۂ مودودیہ تو قدر پر ایمان نہیں رکھتا۔ یہ لوگ خیر و شر کے خدا کی طرف سے ہونے کے منکر ہیں۔ یہ وہی قدریہ ہیں جن کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ وہ اس امت کے آتش پرست ہیں۔" اس استدلال کی بنیاد پر صرف جھوٹی الزام تراشی ہی نہیں کی جا رہی بلکہ ہمیں مرتد کافر کہا جاتا ہے اور ہم پر طرح طرح کے مظالم توڑے جا رہے ہیں۔ بعض جگہ ہمارے لوگوں کو مسجدوں

میں داخل ہونے سے روک دیا گیا ہے۔ علماء سوء عوام میں وعظ کہتے پھرتے ہیں کہ "لوگو خبردار! یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے تمہارا ایمان چوری کیا ہے، انھیں جتنی اذیت دو کم ہے۔"

اس اعتراض کے جواب میں ہم نے واضح کیا ہے کہ ہمارا ایمان قدر پر ہے لیکن رسالہ دینیات میں ایمان صرف پانچ چیزوں پر مشتمل اس لئے بیان کیا گیا ہے کہ قدر پر ایمان ایمان باللہ کے اندر شامل ہے۔ اس جواب کی تائید میں ہم "مسئلہ جبر و قدر" کو پیش کرتے ہیں مگر معترضین آپ کے جواب پر مصر ہیں۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ "خطبات" میں آیت وقال اللہ انی معکم لئن اقمتم الصلوٰۃ...... الخ کی آپ نے جو تفسیر کی ہے وہ عام مفسرین سے مختلف ہے۔ آپ نے "انی معکم" کو "لئن اقمتم" کا جواب بتایا ہے، حالانکہ عام مفسرین نے "انی معکم" کو جملہ مستانفہ قرار دیا ہے اور "لئن اقمتم" کا جواب "لاکفرن عنکم" بتایا ہے۔ آپ نے تو نہ صرف "لاکفرن" جواب نہیں لکھا ہے بلکہ خطبات میں آیت کے اس آخری حصہ کو بالکل چھوڑ ہی دیا ہے۔ معترضین کا دعویٰ ہے کہ نحوی قاعدے کے مطابق بھی "انی معکم" کا ٹکڑہ "لئن اقمتم" کا جواب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ "انی معکم" اور "لئن اقمتم" کے درمیان وقف جائز ہے، حالانکہ شرط و جواب کے درمیان تو وقف جائز نہیں ہو سکتا۔ ہم اس اعتراض کا کوئی جواب نہ دیتے ہیں تو حضرات علماء فوراً یہ کہہ کر ہمارا منہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تم مودودی صاحب کے اندھے مقلد ہو اور عربی کے نحوی قواعد کا انکار کر کے بھی ان کی "تفسیر بالرائے" کی حمایت میں دلیلیں دلاتے ہو۔ براہ کرم واضح فرمائیے کہ آپ کی تفسیر صحیح ہے تو کن دلائل کی بنا پر؟ اور کیا متقدمین میں سے بھی کسی نے یہ تفسیر کی ہے؟ نہیں تو وہ کیا اسباب تھے کہ آپ نے اس نئی تفسیر کی ضرورت محسوس کی؟ فصیح عربی زبان میں اس کی کوئی نظیر ہو تو اس سے ضرور مطلع کیجئے۔

۳۔ خطبات میں عبادات کے مقاصد کے تذکرے پر یہ اعتراض اٹھایا گیا ہے کہ آپ نے صرف ان کے دنیوی فوائد کا تذکرہ کیا ہے اور انھی کو اہم بتایا ہے، اور عبادات کے اخروی فوائد کا یا تو ذکر ہی نہیں کیا ہے یا اگر کیا ہے تو بھی ثانوی درجے کی حیثیت سے۔ اس کے جواب میں بھی ہم اپنے علم

کے مطابق وضاحت کی کوشش کرتے رہے ہیں مگر معترضین ہمارے جواب سے مطمئن نہیں ہوتے۔

بہر حال ان مسائل میں کتابوں کے اصل مصنف کی تصریحات کا مطالبہ عام طور پر کیا جاتا ہے اور ہم بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ خود آپ کی توضیح زیادہ مفید ہوگی۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کتابوں کی عبارتوں میں ضروری ترمیم کر دی جائے۔

آخر میں یہ خوشخبری بھی عرضِ خدمت ہے کہ اندھی مخالفت کا یہ طوفان جتنا جتنا زور پکڑ رہا ہے ہماری دینی دعوت بھی اسی کے ساتھ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ ہمارے لئے خدا تعالیٰ سے دعا فرمایئے۔

جواب:۔

آپ کو مالابار میں جس قسم کی مخالفتوں سے سابقہ پیش آ رہا ہے اس سے بدتر اور اس سے بہت زیادہ کمینہ قسم کی مخالفتوں سے ہم یہاں دو چار ہیں۔ بہر حال ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ صبر کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے کام کرتے چلے جائیں اور اپنی حد تک صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں۔ جو لوگ جس غرض اور جس نیت سے بھی ہماری مخالفت چاہیں، کریں، آخر کار فیصلہ اُس خدا کو کرنا ہے جو ہماری نیت و عمل سے بھی واقف ہے اور ان کی نیت و عمل سے بھی!

(۱) رسالۂ دینیات باب چہارم کے آخر میں جہاں یہ فقرہ لکھا ہے کہ "یہ پانچ عقیدے ہیں جن پر اسلام کی بنیاد قائم ہے"۔ وہاں میری طرف سے یہ حاشیہ لکھ دیا جائے:۔

میں نے یہاں ایمانیات کی تعداد پانچ بتائی ہے۔ یہ شمار قرآن مجید کے ارشاد آمن الرسول بما انزل الیہ .... الآیہ (بقرہ۔ رکوع ۴۰) اور ومن یکفر باللہ وملئکتہ ..... الآیہ (النساء۔ رکوع ۱۹) پر مبنی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث میں والقدر خیرہ وشرہ کو بھی ایمانیات میں شمار کیا گیا ہے اور اس طرح بنیادی عقائد پانچ کے بجائے چھ قرار پاتے ہیں لیکن درحقیقت ایمان بالقدر ایمان باللہ کا ایک جزء ہے اور قرآن میں اس عقیدے کو اسی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے میں نے بھی اس عقیدے کو عقیدۂ توحید کی تشریح میں داخل کر دیا ہے۔ بالکل اسی طرح بعض احادیث

میں جنت اور دوزخ اور صراط اور میزان کو الگ الگ عقائد کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے مگر درحقیقت یہ سب ایمان بالآخرہ کے اجزاء ہیں"۔

مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ مالابار میں بعض علماء نے میری ان عبارتوں کو غلط معنی پہنا کر خواہ مخواہ یہ مشہور کرنا شروع کر دیا ہے کہ میں قدر کا منکر ہوں۔ حالانکہ اگر وہ اسی کتاب کے اسی باب میں وہ بحث پڑھ لیتے جو "انسان کی زندگی پر عقیدۂ توحید کا اثر" کے زیرِ عنوان کی گئی ہے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ میں تقدیر کی بھلائی اور برائی کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے مانتا ہوں۔ یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ لوگ تحقیق کے بغیر دوسروں کی طرف غلط عقیدے منسوب کرتے اور زبردستی ان کو گمراہ ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں، اور ذرا نہیں ڈرتے کہ اس طرح کے بہتان لگانے پر وہ اللہ کے ہاں ماخوذ ہوں گے۔

(۲) آیت وقال اللہ انی معکم کی تفسیر میں معیت کو میں نے نصرت کے معنی میں لیا ہے اور اس بنا پر یہ سمجھا ہے کہ اس نصرت کے لئے اقامت صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ وغیرہ بطور شرط کے ارشاد ہوئے ہیں۔ لیکن اگر انی معکم کے معنی یہ لئے جائیں کہ انی معکم بالعلم والقدرۃ فاسمع کلامکم وارٰی اعمالکم واعلم ضمائرکم واقدر علی ایصال الجزاء الیکم (یعنی میں اپنے علم و قدرت کے اعتبار سے تمہارے ساتھ ہوں اور تمہاری گفتگو میں سنتا ہوں، تمہارے اعمال کو دیکھتا ہوں، تمہاری نیتوں کو جانتا ہوں اور تم کو جزا و سزا دینے پر پوری طرح قادر ہوں) تو اس صورت میں بلاشبہ یہ فقرہ بجائے خود ایک مکمل فقرہ ہوگا اور اس کے بعد لئن اقمتم کو اس سے جدا ایک الگ فقرہ قرار دینا درست ہوگا۔ اس معاملہ میں چونکہ دو تفسیروں کی گنجائش ہے اس لئے انی معکم کے بعد وقف جائز ہے مگر لازم نہیں اور وصل ممنوع نہیں!

جو لوگ میری اس تفسیر کو "تفسیر بالرائے" کہتے ہیں ان کو تفسیر بالرائے کے معنی معلوم نہیں۔ تفسیر بالرائے کے معنی پچھلے مفسرین سے اختلاف کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ ایسی تفسیر کرنے کے ہیں جو قرآن یا حدیث صحیح کے خلاف پڑتی ہو، یا جو قواعدِ لغت کے خلاف ہو۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ نظیر کس چیز کی مانگتے ہیں۔ اگر شرط و جواب شرط کے درمیان تقدیم و تاخیر کی نظیر درکار ہے تو اس کی نظیریں بے شمار ہیں۔ خود قرآن میں ہے : قد افترینا علی اللہ کذباً ان عدنا فی ملتکم (اعراف - ۱۱) اور اگر شرط اور جواب شرط کے درمیان وقف کی نظیر مانگتے ہیں تو میں اس کا قائل کب ہوں کہ اس کی نظیر پیش کروں۔ میں تو خود کہتا ہوں کہ انی معکم کے بعد وقف اس صورت میں جائز ہے جب کہ اس کو جملہ مستانفہ مانا جائے؛ اور اگر اسے جواب شرط مانا جائے تو وقف جائز نہیں۔

(۳) خطبات میں عبادات کے دُنیوی نہیں بلکہ اخلاقی فوائد کو میں نے زیادہ نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں اخروی فوائد کا قائل نہیں ہوں یا انھیں کم اہمیت دیتا ہوں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے لوگوں کی نگاہوں سے عبادات کے اخلاقی، اجتماعی اور تمدنی فوائد اوجھل ہو گئے ہیں، اور ان کے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے لوگ ان عبادات سے غفلت برتنے لگے ہیں۔ اس لیے میں نے ان پہلوؤں کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔ نمایاں وہی چیز کی جاتی ہے جو مخفی ہو یا جس سے عموماً لوگ غافل ہوں، نہ کہ وہ چیز جس سے پہلے ہی لوگ واقف ہوں۔

آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی مدد فرمائے، اور فتنہ پردازوں سے آپ کی حفاظت کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسے موقع پر دعا فرمایا کرتے تھے۔ اللھم انا نجعلک فی نحورھم ونعوذ بک من شرورھم۔ یہی دعا میں بھی مانگتا ہوں۔ جو لوگ محض نفسانیت اور تعصب اور حسد کی بنا پر ہمارے خلاف طرح طرح کے فتنے اٹھا رہے ہیں اور محض اپنے ذاتی کینے کی وجہ سے اُس خیر کا راستہ روکنا چاہتے ہیں جس کے لیے ہم کوشش کر رہے ہیں، ان کے شر سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اور خدا سے ہی درخواست کرتے ہیں کہ وہ ان سے نمٹ لے۔

(ا۔م)

جماعت اسلامی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کی مہم

سوال:

میں اپنے قصبہ ۔۔۔۔۔ میں جماعت اسلامی کی طرف سے کام کر رہا ہوں۔ چند اور رفیق بھی میرے ساتھ ہیں۔ انفرادی مخالفت پہلے بھی تھی جس کی رپورٹ میں اپنی جماعت کے مرکز کو بھیجتا رہا ہوں۔ لیکن اب ایک معاملہ ایسا پیش آ گیا ہے کہ آپ سے استفسار کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔

پرسوں سے ایک مولانا صاحب جن کا نام ۔۔۔۔۔۔ ہے یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں اور انھوں نے قصبہ میں اپنے خاص اشتہارات (ایک نقل منسلک ہے[1]) کافی تعداد میں تقسیم کرائے ہیں پھر شام کو ایک بہت بڑے مجمع میں تقریر کر کے جماعت اسلامی کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا ہے۔ میں چند باتیں اُن کی عرض کر کے ملتمس ہوں کہ ضروری تصریحات سے جلد از جلد میری رہنمائی فرمائی جائے۔

مولانا مذکور کے ارشادات یہ تھے:۔

(۱) جماعت اسلامی کے بڑے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب نہ تو کوئی مستند عالم ہیں نہ کوئی مفسر۔ صرف اپنے ذاتی علم کی بنا پر ترجمہ اور تفسیر کرتے ہیں۔ اس کی مثال انھوں نے یہ دی ہے کہ لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ کا ترجمہ خطبات میں یہ ہے کہ "نیکی کا مرتبہ تم کو نہیں مل سکتا جب تک کہ تم وہ سب چیزیں خدا کے لیے قربان نہ کر دو جو تم کو عزیز ہیں"۔ اس کی تشریح میں مولانا ئے مذکور نے یہ فرمایا کہ دیکھو جماعت اسلامی تم کو نیک اور مسلمان نہیں سمجھتی جب تک کہ تم کل مال خدا کی راہ میں جماعت کو نہ دے دو۔ ورنہ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ تم نیکی میں کمال حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ اپنی پیاری چیزوں سے کچھ خدا کی راہ میں قربان نہ کر دو۔ مطلب یہ ہے کہ نیک اور مسلمان تو تم ہر وقت ہو ہی، جب تک تم یہ کہتے ہو کہ ہم مسلمان ہیں، البتہ کامل جب ہو گے جب پیاری شے میں سے کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دو گے۔

قرآن کے چند ترجموں میں میں نے بھی دیکھا ہے کہ لفظی ترجمہ یہی ہے جو انھوں نے کیا ہے۔

[1] یہ ایک مطبوعہ اشتہار ہے۔ جس میں تین دیوبندی علماء کے فتوے درج ہیں۔

اس کی کیا تاویل ہو سکتی ہے؟

(۲) پھر انھوں نے یہ کہا کہ دیکھو جماعت اسلامی قرآن میں تحریف کرکے اس کو اپنے منشا کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہے جو بہت بڑا ظلم ہے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے ایک رسالہ ترجمان القرآن جلد ۱۲، عدد ۲، ماہ صفر مطابق اپریل ۱۹۳۶ء ص ۱۳۹ پر سورۂ بقرہ رکوع ۲۴ کی ایک آیت پیش کی ہے۔ رسالۂ مذکور میں تحریر کردہ آیت یہ ہے: یا ایھا الناس ادخلوا فی السلم کافۃ الخ حالانکہ قرآن پاک میں یہی آیت اس طرح درج ہے: یا ایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ۔ الخ۔ یہ ان کی ایسی دلیل ہے جو واقعی ہے اور مخالف لوگ اس تحریف سے جتنا بھی مشتعل ہوں کم ہے۔ چونکہ یہ قرآن کا معاملہ ہے جس کی بقا کے لئے ہر مسلمان خواہ وہ بے عمل ہی کیوں نہ ہو، جان کی بازی لگا سکتا ہے، تو آپ سے یہ معلوم کرنا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟

مولانا مذکور نے اپنی تقریر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ میں نے جماعت اسلامی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور جب تک اس کام میں کامیابی حاصل نہ کرلوں گا دوسرا کام اپنے اوپر حرام سمجھوں گا۔ اسی لئے انھوں نے چند علماء کے فتوے کرچھپنے کے لئے بھیجے ہیں جن کے ذریعے پروپگنڈہ کیا جائے گا۔

جواب:

جو حالات آپ نے لکھے ہیں وہ اس سے کچھ مختلف نہیں ہیں جو پاکستان میں ہر جگہ رونما ہیں۔ ہم اور ہمارے مخالفین، دونوں اپنا اپنا نامۂ اعمال خود تیار کر رہے ہیں۔ جن اعمال کو ہم اپنے حساب میں درج کرانا چاہتے ہیں اُن کے لئے کوشاں ہیں اور دوسرے فضول کاموں میں اپنا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس کے برعکس ہمارے مخالفین نے اگر اپنے لئے یہی پسند کیا ہے کہ ان کے نامۂ اعمال میں ہماری مخالفت ہی سب سے نمایاں مقام پائے تو ضرور وہ اس کارِ خیر کو بڑھ چڑھ کر انجام دیں۔ ایک وقت آئے گا کہ ہم سب کے ہاتھ میں اپنا اپنا تیار کردہ کارنامۂ حیات دیدیا جائے گا اور حکم ہوگا کہ اقرأ کتابک کفیٰ بنفسک الیوم علیک حسیبا۔

جو مولانا صاحب آپ کے علاقے میں جماعتِ اسلامی کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کا بیڑا اٹھائے پھر رہے ہیں ان کے اعتراضات کا مختصر جواب یہ ہے :

(۱) خطبات کے جس مقام کو انھوں نے نشانۂ ملامت بنایا ہے وہ "زکوٰۃ کی حقیقت" کے زیرِ عنوان آپ خود تلاش کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ لن تنالوا البر الخ کا ترجمہ میں نے یہ کیا ہے "تم نیکی کے مقام کو نہیں پا سکتے جب تک کہ وہ چیزیں خدا کی راہ میں قربان نہ کرو جن سے تم کو محبت ہے۔" اور اس سے میں نے مراد یہ لی ہے کہ اللہ کا دوست بننے اور اس کی پارٹی (حزب اللہ) میں شامل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اللہ کی محبت پر جان، مال، اولاد، خاندان، وطن، ہر چیز کی محبت کو قربان کر دے۔ اس کے ساتھ ذرا مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ و تشریح پر بھی نگاہ ڈال لیں۔ وہ ترجمہ یہ فرماتے ہیں کہ "تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔" اور اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "شاید یہود کے ذکر میں یہ آیت اس واسطے فرمائی کہ ان کو اپنی ریاست عزیز تھی جس کے جاتے کے خوف سے نبی کے تابع نہ ہوتے تھے۔ تو جب تک وہی نہ چھوڑیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں درجۂ ایمان نہ پاویں۔" (ملاحظہ ہو: مترجم حمائل شریف مطبوعہ ۱۳۵۷ھ، ص ۹۷)۔ اب ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ نہ میرا ترجمہ ہی مولانا ممدوح کے ترجمہ سے کچھ زیادہ مختلف ہے اور نہ اس کی تشریح ہی میں معنی کے لحاظ سے کوئی بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد معترض نے میرے ترجمہ و تشریح سے جو معنی نکالے ہیں ان پر دوبارہ ایک نظر ڈال لیجیے۔ آخر میرے ترجمہ و تشریح سے یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ جب تک کوئی شخص اپنا سارا مال خدا کی راہ میں جماعتِ اسلامی کے حوالے نہ کر دے یہ جماعت اس کو نیک اور مسلمان نہیں سمجھتی؟ اس طرح جو لوگ دوسروں کو مطعون کرنے کے لئے اپنی طرف سے غلط باتیں گھڑ کر ان کی طرف منسوب کرتے ہیں ان کی یہ حرکت خود ہی ظاہر کر دیتی ہے کہ وہ نفسانیت کی بنا پر مخالفت کر رہے ہیں نہ کہ للہیت کی بنا پر۔

(۲) دوسری مثال جو انھوں نے دی ہے اس کو آپ کے دیئے ہوئے حوالے سے میں نے

اپریل ۳۵ء کے ترجمان القرآن میں نکال کر دیکھا اور معلوم ہوا کہ یہاں آیت نقل کرنے میں واقعی مجھ سے سخت غلطی ہوگئی ہے اور افسوس ہے کہ اس غلطی کی وجہ سے ترجمہ بھی غلط ہوگیا ہے۔ اس غلطی کو آج تیرہ سال ہوگئے۔ اس دوران میں آج تک نہ میری ہی نگاہ اس پر پڑی اور نہ کسی نے مجھ کو اس طرف توجہ دلائی۔ معترض بزرگ کا شکریہ کہ انھوں نے اس دیدہ ریزی کے ساتھ میری خطاؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور ایسی سخت غلطی پر ان کے ذریعے مجھے تنبہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے، وہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سہو تھا یا دانستہ تحریف۔ بہرحال میرا معاملہ تو اللہ سے ہے۔ معترض بزرگ اگر پبلک کو حاکم حقیقی سمجھتے ہیں تو انھیں پورا اختیار ہے کہ اس کو دانستہ تحریف قرآن کے جرم کا ایک کھلا ہوا ثبوت کہہ کر لوگوں کے سامنے پیش کریں اور اس کا جتنا فائدہ اس دنیا میں اٹھا سکتے ہوں اٹھائیں۔

اب چند کلمات ان فتووں کے متعلق بھی عرض ہیں جو جناب مولانا مہدی حسن صاحب اور مولانا اعزاز علی صاحب اور مولانا فخر الحسن صاحب نے جماعت اسلامی کے خلاف صادر فرمائے ہیں۔ ان فتووں میں مجرد حکم بیان کیا گیا ہے۔ نہ تو مولانا مہدی حسن صاحب نے یہ بتایا کہ میری کتابوں اور مضامین میں کیا باتیں "اہل السنت والجماعۃ کے طریقہ کے خلاف" ہیں، اور نہ انھوں نے کہاں سے یہ نتیجہ نکالا کہ میں "صحابۂ کرام اور ائمۂ مجتہدین کے متعلق اچھا خیال نہیں رکھتا"، اور نہ حدیث کے متعلق میرے کیا خیالات ہیں جو ان کے نزدیک "ٹھیک نہیں ہیں"، اور میں نے کہاں یہ لکھا ہے کہ میں "بے عمل مسلمانوں کو مسلمان ہی نہیں سمجھتا"۔ اور نہ مؤخر الذکر دونوں بزرگوں ہی نے کچھ اتنی سی مزید تکلیف گوارا کی کہ وہ زہر پیش کیا جو جماعت کی جانب سے شہد میں ملا کر مسلمانوں کو استعمال کرایا جارہا ہے اور نہ وہ دلائل ارشاد فرمائے جن کی بنا پر وہ مرزائیوں کو جماعت اسلامی کے "اسلاف" (افسوس کہ دونوں صاحبوں کو شریف آدمیوں کی سی زبان لکھنے کی توفیق بھی میسر نہ ہوئی) قرار دیتے ہیں اور اس جماعت کو اُن سے بھی زیادہ دین کے لئے مضر رساں بتلاتے ہیں۔ اگر یہ اجمال و اختصار محض ضیقِ وقت کی وجہ سے ہے، جیسا کہ انھوں نے بیان فرمایا ہے، تو یہ بات نہایت افسوسناک

ہے کہ جن لوگوں کے پاس دلائل و وجوہ بیان کرنے کے لئے وقت نہیں ہے ان کو دوسروں پر اس قسم کے لغو اور مہمل فتوے جڑنے کے لئے کافی وقت مل جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے فتووں کے لئے کوئی معقول دلیل اپنے پاس نہیں رکھتے اس لئے انھوں نے محض چند سطری احکام جاری کر کے اپنے بغض کی تسکین کا سامان کیا ہے، تو میں اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان کے حق میں خدا سے نیک ہدایت کی دعا کر دوں۔ بہر حال، آپ موقع پائیں تو ان صاحبوں کو میرا یہ پیغام پہنچا دیں کہ آپ پر میرا، اور جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا اور عام مسلمانوں کا یہ اخلاقی حق ہے کہ آپ اپنے فتوے کے دلائل و وجوہ بیان فرمائیں۔ ان کی جو بات حق ہو گی اسے قبول کرنے میں انشاء اللہ دریغ نہ کیا جائے گا، اور میں اپنی حد تک یقین دلاتا ہوں کہ مجھے کبھی اپنی غلطی تسلیم کرنے میں نہ تامل ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا؛ بشرطیکہ میری غلطی دلائل سے ثابت کی جائے نہ کہ سب و شتم سے۔ اور اگر انھیں کوئی غلط فہمی لاحق ہوئی ہو گی تو اسے دلائل کے ساتھ رفع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ "ترجمان القرآن" کے صفحات خدمت کے لئے حاضر ہیں۔ جس طرح مولانا حکیم عبدالرشید محمود صاحب گنگوہی کا مضمون بے کم و کاست یہاں شائع کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے، اسی طرح ان کے ارشادات بھی کسی حذف و ترمیم کے بغیر درج کئے جائیں گے اور جواب عرض کر دیا جائے گا۔ اشتہار بازوں کے لئے اوچھے ہتھیار فراہم کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ اپنے علمی وقار کے ساتھ سامنے تشریف لائیں اور اپنی پوری بات کہہ کر دوسرے کا پورا جواب سننے کے لئے تیار رہیں۔

دوسرے وہ حضرات بھی جو وقتاً فوقتاً اپنی مجلسوں میں میرے اور جماعت اسلامی کے خلاف اظہار خیال فرماتے رہتے ہیں، میری اس گزارش کے مخاطب ہیں۔ ان سے کہیں سابقہ پیش آئے تو عرض کر دیجئے کہ آپ کی شانِ تقویٰ اور جلالتِ قدر کے لحاظ سے یہ طریقہ کچھ موزوں نہیں ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ شخصِ متعلق کو اپنے اعتراضات سے آگاہ فرمائیے تاکہ یا تو اس کی اصلاح خیال ہو جائے یا آپ کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے اکثر اصحاب نے جماعت اسلامی کی

مطبوعات کو بالاستیعاب نہیں دیکھا ہے بلکہ یا تو کچھ نیازمندوں سے سنی ہوئی باتوں پر یقین کر لیا ہے یا بعض ہوشیار لوگوں نے خاص خاص عبارتیں پوری ہوشیاری کے ساتھ انھیں دکھائی ہیں، اور انہی کمزور بنیادوں پر بدگمانیوں کے بڑے بڑے قصر تعمیر کر ڈالے گئے ہیں۔ اگر یہ حضرات کچھ اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے اور کچھ اخلاقی جرأت سے کام لے کر ہمیں اپنے اعتراضات سے مطلع فرمائیں تو ہم پوری کوشش کریں گے کہ ان کو اپنے موقف سے اچھی طرح آگاہ کر دیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اشتہار باز حضرات کو اور ان لوگوں کو جو اپنے رسائل و جرائد میں مسلسل کینہ توزی کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں، ہم منہ لگانے کے قابل نہیں سمجھتے۔ (ا-م)

تحریکِ اقامتِ دین پر دین کے سرپرستوں کی مزید عنایات

سوال :

جماعت اسلامی کے تحت قائم شدہ حلقۂ ہمدرداں تو ہمارے علاقے میں پہلے سے تھا، لیکن باقاعدہ جماعتی کام حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ عوام کا رجحان جماعت کی طرف کثرت کے ساتھ دیکھ کر ہمارے علمائے دیوبند، سہارنپور، دہلی اور تھانہ بھون نے جو فتاوے شائع کئے ہیں وہ ارسالِ خدمت ہیں، اور علمائے دیوبند کا ایک فتویٰ جو کہ ابھی زیرِ کتابت ہے، مفصل کتابی شکل میں آنے والا ہے۔ آنے پر ارسال کر دیا جائے گا۔

ان فتووں کے جواب میں سکوت مناسب نہیں۔ غور کر کے جواب دیجئے۔[1] یہ بھی تحریر فرمایئے کہ اب آپ کا تعلق ہندوستان کی جماعت اسلامی سے کیا ہے؟ کچھ تعلق ہے یا نہیں؟ مولانا ابواللیث اصلاحی جو کہ ہندوستان کی جماعت کے امیر ہیں حقیقت میں امیر ہیں یا صرف خانہ پُری کے لئے فرضی ہیں؟ نیز یہ کہ

---

[1] حضرات علماء کی طرف سے فتووں کی بوچھاڑ شروع ہونے پر پے در پے جو سوالات موصول ہوئے ہیں ان کو اس عنوان کے تحت یکجا کر دیا گیا ہے۔ (ن-ص)

اگر آپ نے کسی عالم سے فیض حاصل کیا ہو تو ان کا نام بھی تحریر فرمائیں اور اگر کوئی اور وجوہ آپ کو ان فتووں کے بارے میں معلوم ہوں تو وہ بھی تحریر کریں کہ اس قدر شدت کے ساتھ یہ طوفان کیوں اٹھ رہا ہے؟

جواب:

میں نے ان سب فتووں کو بغور پڑھ لیا ہے۔ یہ کسی جواب کے لائق نہیں ہیں۔ صرف اس لائق ہیں کہ انھیں اٹھا کر رکھ دیا جائے اور اُس وقت کا انتظار کیا جائے جب اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ میں نے پوری کوشش کی کہ ان فتووں میں مجھے اپنی کسی ایسی غلطی کا نشان مل جائے جو واقعی میں نے کی ہو اور ان حضرات نے دلائل کے ساتھ ثابت کر دی ہو۔ ایسی کوئی چیز ملتی تو میں یقیناً اس کا جواب دینے کے بجائے مان لیتا اور اپنی اصلاح کر لیتا۔ میں نے یہ کوشش بھی کی کہ اگر فی الواقع ان حضرات کو کوئی ایسی غلط فہمی ہوئی ہے جو دیانۃً کسی شخص کو میری کسی تحریر یا کسی عمل سے ہو سکتی ہو تو اسے معلوم کر دوں۔ اگر ان فتووں میں اس طرح کی کوئی چیز نظر آجاتی تو میں اسے صاف کرنے میں بھی ہرگز تامل نہ کرتا۔ لیکن مجھے ان کے غائر مطالعہ کے بعد یہ اطمینان ہو چکا ہے کہ یہ فتوے ان دونوں طرح کی باتوں سے بالکل خالی ہیں، اور ان میں بجز تحریف، بہتان اور الزام تراشی کے اور کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا میں ان پر سکوت اختیار کرنے میں حق بجانب ہوں۔ اگر کوئی مسلمان ان فتووں کو دیکھ کر مجھ سے بدگمان ہو یا اُس خیر سے رُک جائے جس کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں تو اس کی ذمہ داری سے میں عنداللہ بری ہوں۔ اس کی پوری ذمہ داری خالصتاً ان لوگوں پر ہے جو مناع للخیر بنے ہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس نیت سے بنے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم ان غلط بیانیوں اور تحریفات کا پردہ کیوں نہیں چاک کر دیتے جو دعوت الی الخیر کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ میں عرض کروں گا کہ اگر کوئی ایک فتویٰ یا ایک اشتہار ہوتا تو شاید میں بادلِ ناخواستہ اس کی غلطیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش بھی کر گزرتا، اگرچہ ایسی چیزوں کی طرف توجہ کرنا میرے لئے سخت کراہیت کا موجب ہوتا ہے، لیکن یہاں تو پاکستان سے

ہندوستان تک ہر طرف فتووں، پمفلٹوں، اشتہاروں اور مضامین کی ایک فصل اُگ رہی ہے جس میں کمیونسٹ، سوشلسٹ، فرنگیت زدہ ملحدین، قادیانی، منکرینِ حدیث، اہلِ حدیث، بریلوی اور دیوبندی سب ہی اپنے اپنے شگوفے چھوڑ رہے ہیں اور آئے دن نئے نئے شگوفے پھوٹتے رہتے ہیں۔ اس فصل کو آخر کون کاٹ سکتا ہے اور کہاں تک کاٹ سکتا ہے۔ مجھے اگر دنیا میں اور کوئی کام نہ کرنا ہو تو میں اسے کاٹنے میں اپنی عمر کھپا دوں، اور جماعت اسلامی اگر اپنے مقصد اور اپنے کام سے دست بردار ہو جائے تو اس پر اپنی محنت ضائع کرے۔ ہمارے مخالفین تو یہی چاہتے ہیں کہ ہم اس حماقت میں مبتلا ہوں اور اس جھاڑ جھنکار سے الجھ جائیں تاکہ فساق و فجار کی قیادت کو اپنا کام کرنے کے لئے صاف راستہ مل جائے۔ لیکن ہم نے ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں، ہم کہتے ہیں کہ یہ شیطان کی فصل ہے، وہی اسے کاٹے گا، خود نہ کاٹے گا تو سنۃ اللہ یہی ہے کہ بالآخر اس کو خود ہی اسے کاٹنا پڑے گا۔

آپ نے جو سوالات کئے ہیں ان کے مختصر جوابات یہ ہیں:-

(۱) تقسیم کے بعد فروری ۱۹۴۸ء میں جماعت اسلامی بھی مسلم لیگ کی طرح باقاعدہ تقسیم ہو گئی تھی۔ اب ہندوستان کی جماعت اسلامی کا نظام پاکستان کی جماعت اسلامی سے بالکل الگ ہے۔ نہ اس کی ذمہ داری میں ہم شریک ہیں اور نہ ہماری ذمہ داری میں وہ شریک ہے۔

(۲) مولانا ابواللیث جماعت اسلامی ہند کے ویسے ہی امیر ہیں جیسا میں جماعت اسلامی پاکستان کا امیر ہوں۔ اگر میں فرضی یا خانہ ٹری کا امیر نہیں ہوں تو آخر ان کے متعلق ایسا گمان کیوں کیا جائے۔ اس طرح کی بدگمانی کے لئے کوئی معقول بنیاد اگر ہو سکتی تھی تو یہ ہو سکتی تھی کہ ہماری یہاں کی پالیسی میں ان کا، یا وہاں کی پالیسی میں میرا کوئی دخل ہوتا۔ لیکن تقسیم کے بعد سے کوئی شخص یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ ایسا کوئی تعلق ہمارے درمیان ہے۔ حد یہ ہے کہ ہمارے درمیان نجی مراسلت تک بند ہے تاکہ کسی کو فتنہ انگیزی کا بہانہ نہ مل سکے۔ افسوس ہے کہ لوگ مخالفت کے جوش میں اندھے ہو کر بلا ثبوت ایسی باتیں زبان سے نکال دیتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ ان کے لئے

تو یہ صرف دل کے بخار نکالنے کا ایک راستہ ہے مگر دونوں ملکوں کے موجودہ سیاسی حالات میں یہ سیکڑوں خاندانوں کی زندگی کے لئے ایک تباہ کن الزام بن سکتا ہے۔

(۳) یہ ایک لاحاصل سوال ہے کہ میں نے کس عالم سے فیض حاصل کیا ہے۔ یہ سوال تو اُس سے کرنا چاہیئے جس نے کوئی علمی کام نہ کیا ہو اور جس کے علمی مرتبہ و مقام کو جاننے کے لئے مدرسہ کی سند اور استادوں کے ناموں کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ ہو۔ میں نے کام کیا ہے اور میرا کام کوئی چھپا ہوا نہیں بلکہ چھپا ہوا سب کے سامنے موجود ہے۔ اُس کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے کہ میں نے کیا کچھ پڑھا ہے اور جو کچھ پڑھا ہے اسے کتنا ہضم کیا ہے۔

(۴) میرے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ میری اور جماعت اسلامی کی اس قدر شدت کے ساتھ مخالفت یکایک اب کیوں شروع ہو گئی ہے اور یہ فتوے کن وجوہ سے دیئے جا رہے ہیں لیکن اگر میں اس کو جان بھی لیتا تو یہ غیر ضروری بحث ہے کہ کسی نے اعتراض کیا تو کیوں کیا۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا اعتراض معقول ہے یا نامعقول۔ معقول اعتراض ہوتا ہے تو اسے مان لیتے ہیں یا اس کا معقول جواب دیتے ہیں اور اگر نامعقول اعتراض ہوتا ہے تو اسے ہوا میں تحلیل ہونے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ (ا۔م)

سوال:

عنایت نامہ مایوسی کی حالت میں پہنچا، اس نے میرے قلب و دماغ پر جو کچھ اثر کیا وہ احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔

میں نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کو لے کر میں ہر جماعت میں داخل ہوا لیکن ہر جگہ سے بد دل ہو کر لوٹا اور آخر کار فیصلہ کر لیا کہ اب کسی جماعت میں داخل نہ ہوں گا بلکہ انفرادی حیثیت سے جو کچھ خدمتِ دین ممکن ہو گی انجام دوں گا۔ اسی خیال کے تحت محلے کی مسجد میں بعد نمازِ فجر تفسیر حقانی اور بعد نمازِ عشاء رحمۃ للعالمین مولفہ قاضی سلمان منصور پوری یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء سے سنانی شروع کی۔ میرے خیالات اس کام سے اور پختہ ہو گئے۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں اتفاقیہ ایک شخص کے ذریعے مجھے "سیاسی کشمکش" کا تیسرا حصہ

مل گیا۔ میں نے اس کو کئی مرتبہ پڑھا، میرے خیالات کی دنیا نے پلٹا کھایا اور اب میں جماعت اسلامی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ لٹریچر کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا اور پھر مسجد میں خطبات سنانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کو شروع کرنے کے بعد وہ فتنہ پیدا ہوا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔

یہاں فتنا میں یکے بعد دیگرے نو یا نو فتوے پہنچ رہے ہیں جن کی نقلیں ارسال خدمت ہیں۔ ادھر میں جماعت کے اجتماع میں شرکت کے بعد جب لوٹا تو معلوم ہوا کہ بستی میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ اب اگر "مودودی خیالات" کے لوگ مسجد میں خطبہ وغیرہ پڑھیں تو ان کو ہٹا دینا چاہیے۔ چنانچہ اپنے امیر جماعت نے استفسار کے جواب میں مشورہ دیا کہ اس سلسلے کو روک دیا جائے۔

اس دوران میں میں نے بعض بڑے علما سے خط و کتابت بھی کی اور ان حضرات کے خطوط میں سے بعض کی نقلیں بھیج رہا ہوں۔ نقلوں پر ترتیب کے لئے میں نے نمبر ڈال دیے ہیں۔

یوں تو میں عملی کام کے لئے ساری ہدایات اپنی مقامی جماعت سے حاصل کرتا ہوں، لیکن چونکہ ان فتووں اور خطوط کا تعلق آپ کی ذات سے اور آپ کی تصانیف سے ہے: لہٰذا ان کو آپ تک پہنچا رہا ہوں۔ آپ براہِ کرم ان کے جوابات تحریر فرمائیں اور اس کی اجازت دیں کہ جوابات کو شائع کیا جاسکے۔

جواب:

آپ کے عنایت نامے سے اُن اسباب کا سراغ ملا جن کی وجہ سے دیوبند اور سہارنپور سے لے کر مدرسۂ امینیہ تک یکایک یہ طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ ممکن ہے اسباب کچھ اور بھی ہوں، لیکن ایک قریبی سبب آپ کا (اور شاید آپ جیسے بعض اور لوگوں کا بھی) وہ بے جا جوشِ تبلیغ ہے جس سے مغلوب ہو کر آپ نے بطورِ خود درس و افتاء اور مذہبی پیشوائی کے بڑے بڑے مسند نشینوں کو جماعت اسلامی اور اس کی تحریک کی طرف دعوت دے ڈالی، حالانکہ اس سے بارہا منع کیا جاچکا تھا۔ بعید نہیں کہ آپ کی طرح کے بعض جوشیلے حضرات نے ان دینی مراکز کے گرد و پیش کی دنیا میں بھی پہنچ کر کچھ تبلیغی سرگرمیاں دکھائی ہوں اور وہ ان حضرات کے بھڑک اٹھنے کی موجب بن

گئی ہوں۔ آپ تقسیم ہند سے پہلے کی روداد یں اٹھا کر دیکھ لیجئے، ان میں جگہ جگہ یہ چیز آپ کو ملے گی کہ لوگوں نے بار بار اکابر علماء کو دعوت دینے پر اصرار کیا ہے اور میں نے ہمیشہ نہ صرف خود اس سے پہلو تہی کی ہے، بلکہ جماعت کے عام ارکان کو بھی (بجز ان لوگوں کے جو خود اس کوچہ سے تعلق رکھتے ہوں) تاکید کی ہے کہ دعوت کی غرض سے علماء کے پاس جانا تو درکنار ان کے قریب تک نہ پھٹکیں۔ مگر افسوس ہے کہ لوگوں نے میرے اس انکار اور ممانعت کے راز کو نہ سمجھا اور آخر کار اس کی غلط دریافت کر بیٹھے۔ بعض لوگوں نے مجھ پر الٹی یہ بدگمانی بھی کی کہ میں نخوت اور تکبر کی بنا پر مذہبی آستانوں کی حاضری سے انکار کرتا ہوں۔ حالانکہ میرا حال یہ ہے کہ میں اپنے اس نصب العین کی خاطر "کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل" جانے کے لئے تیار رہوں اور ان شاء اللہ ہمیشہ تیار رہوں گا۔ ان آستانوں سے میرے گریز اور دوسروں کو بغرضِ دعوت ان کے پاس جانے سے منع کرنے کی وجہ ہرگز وہ نہ تھی جو لوگوں نے بدگمانی کی بنا پر سمجھی، بلکہ ایک دینی مصلحت تھی جس کو میں اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر ایک مدت سے خوب سمجھ چکا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کی اکثریت یا تو قلتِ فہم کے باعث، یا کم ہمتی کے سبب سے، یا پھر اپنی نااہلی کے اندرونی احساس کی وجہ سے دین و دنیا کی اُس تقسیم پر راضی ہو چکی ہے جس کا تخیل اب سے مدتوں پہلے عیسائیوں سے مسلمانوں کے ہاں درآمد ہوا تھا۔ انھوں نے چاہے نظری طور پر اسے پوری طرح نہ مانا ہو، مگر عملاً وہ اسے تسلیم کر چکے ہیں کہ سیاسی اقتدار اور دنیوی ریاست و قیادت غیر اہلِ دین کے ہاتھ میں رہے، خواہ وہ فساق و فجار ہوں یا کفار و مشرکین، اور مذہب کی محدود دنیا میں اِن کا سکہ رواں رہے، چاہے یہ محدود دنیا بے دین سیادت و قیادت کی مسلسل تاخت سے روز بروز سکڑ کر کتنی ہی محدود ہوتی چلی جائے۔ اس تقسیم کو قبول کر لینے کے بعد یہ حضرات اپنی تمام تر قوت دو باتوں پر صرف کرتے رہے ہیں: ایک اپنی محدود مذہبی ریاست کی حفاظت جس کے مسائل اور معاملات میں کسی کی مداخلت انھیں گوارا نہیں ہے۔ دوسرے کسی ایسی بے دین قیادت سے گٹھ جوڑ جو مذہب کے محدود دائرے میں۔ اِن کی اجارہ داری کے بقا کی

ضمانت دے دے اور اس دائرے سے باہر کی دنیا پر جس فسق اور جس ضلالت کو چاہے فروغ دیتی رہے۔ اس طرح کی ضمانت اگر کسی قیادت سے انھیں مل جائے تو یہ دل کھول کر اس کا ساتھ دیتے ہیں اور خود جان لڑا کر اسے قائم کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے، خواہ اس کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ کفر و الحاد اور فسق و ضلالت تمام سیاسی، معاشی اور تہذیبی قوتوں پر قابض ہو کر پورے دین کی جڑیں ہلا دے اور اس محدود مذہبیت کے پنپنے کے امکانات بھی باقی نہ رہنے دے جس کی ریاست اپنے لیے محفوظ رکھنے کی خاطر یہ لوگ اس قدر پاپڑ بیل رہے ہیں۔

ان حالات میں اگر کوئی شخص یا گروہ دین اور اہلِ دین کی قیادت قائم کرنے کا ارادہ کرے اور دین و دنیا کی اس تقسیم کو توڑ کر زندگی کے پورے دائرے میں دین کا سکہ رواں کرنے کی کوشش شروع کر دے، تو بجائے اس کے کہ یہ حضرات خوش ہوں اور آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیں، یا کم از کم اس کام کو ہونے ہی دیں، ان کے آستانوں میں ایک کھلبلی سی مچ جاتی ہے، کیونکہ انھیں فوراً یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اس نوعیت کی قیادت قائم ہو جانے سے وہ ذرا سی جائداد بھی ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی جسے اتنی بڑی قیمت دے کر انھوں نے بچایا تھا۔ تاہم چونکہ معاملہ دین کا ہوتا ہے اس لیے کچھ مدت تک وہ خون کا گھونٹ پی کر اس کی باتوں کو برداشت کرتے رہتے ہیں اور احتیاط کے ساتھ اس امر کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ یہ بلا ان کی سرحدوں سے ذرا دور دور رہے۔ پھر اس کو جتنا جتنا فروغ ہوتا جاتا ہے ان کی بے چینی بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت وہ آجاتا ہے کہ مخصوص حلقوں میں سرگوشیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور کوشش کی جانے لگتی ہے کہ ہر آیندہ و روندہ کے دل میں اس کے خلاف ایک نہ ایک وسوسہ ڈال دیا جائے۔

بات اگر اس حد تک بھی ٹھیری رہے تو بسا غنیمت ہے۔ لیکن اگر کہیں ان کی مخصوص رعیت میں سے کچھ زیادہ آدمی ٹوٹ ٹوٹ کر اس تحریک میں شامل ہونے لگیں، یا اس کے کچھ غیر محتاط کارکن خاص طور پر ان کے مراکز کے گرد و پیش چکر کاٹنے لگیں، یا کوئی جوشیلا فرد کسی بڑے

حضرت کو براہِ راست دعوت دے بیٹھے، تو پھر معاملہ حدِ برداشت سے گزر جاتا ہے۔ اُس وقت ان کی نگاہ میں کوئی کفر، کوئی الحاد، کوئی بڑے سے بڑا فتنۂ ضلالت، اور کوئی سخت سے سخت سیلابِ فسق و فجور بھی اتنا اہم نہیں رہتا کہ اس کے استیصال کی فکر انھیں اس دینی تحریک کے استیصال کی فکر سے زیادہ یا اس کے برابر لاحق ہو۔ وہ خود اور ان کے سارے متوسلین خاص طور پر اس شخص کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو اس تحریک کے چلانے کا اصل ذمہ دار ہو۔ خوردبینیں لگا لگا کر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ کہاں کوئی ایسی گنجائش ملتی ہے کہ اس پر کفر یا کم از کم گمراہی کا فتویٰ لگایا جا سکے، یا اس کے سر کسی دعوے کا الزام تھوپا جا سکے، یا اسے اور اس کے ساتھیوں کو ایک فرقہ بنا کر عام مسلمانوں سے کاٹا جا سکے، یا اور کچھ نہیں تو اسے کم از کم اتنا بدنام ہی کر دیا جائے کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ عناد کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو جب خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی احادیث تک میں ایسے فقرے مل سکتے ہیں جنھیں سیاق عبارت سے الگ کر کے اور توڑ مروڑ کر بدترین اعتراضات کا ہدف بنانے کی گنجائش نکل آتی ہیں تو پھر کسی اور کی کیا ہستی ہے کہ اس کی تحریر و تقریر میں اس طرح کے لوگوں کو کہیں سے کچھ ہاتھ نہ آسکے۔ سیدھی طرح اگر کوئی چیز نہیں ملتی تو وہ ٹیڑھی ترکیبوں سے (جی ہاں! انھی ترکیبوں سے جو بریلوی حضرات نے مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود الحسن اور مولانا اشرف علی رحمہم اللہ کے خلاف استعمال کیں) کچھ نہ کچھ نکال کر رہتے ہیں اور ان پر فتوے جڑتے ہیں۔

میں اس راز سے واقف تھا اس لئے اول روز سے ہی میں ان حضرات کے ساتھ سخت احتیاط کی روش برتتا رہا اور دوسروں کو احتیاط کا مشورہ دیتا رہا۔ لیکن افسوس کہ رفیقوں اور ہمدردوں نے میری بات نہ مانی اور قریب قریب وہ ساری ہی غلطیاں کر بیٹھے جن کی وجہ سے تمام مذہبی توپ خانوں کے دہانے بیک وقت ہماری طرف کھل گئے۔ اب اگر آپ لوگ واقعی اس تحریک کے خیرخواہ ہیں تو براہِ کرم میری نصیحت قبول کریں اور حسب ذیل ہدایات کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے رہیں:-

(۱) کسی بڑے حضرت کو زبان و قلم سے براہِ راست دعوت دینے کی ہرگز جرات نہ کریں۔ آپ لوگ تو کلمۂ حق سمجھ کر اُن تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یہ حضرات اس کے لئے اَحق ہیں، مگر وہاں یہ حرکت بالکل ہی ایک دوسری نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

(۲) طبقۂ علماء میں کوئی ایسا شخص تبلیغ کا خیال تک نہ کرے جو خود اس طبقے سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ علماء میں سے جو لوگ حق پرست ہیں ان تک بالواسطہ دعوت پہنچ رہی ہے اور وہ خود آہستہ آہستہ توجہ فرما رہے ہیں۔ مگر ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ اس لباس میں کہاں حق پرست دل چھپے ہوئے ہیں اور کہاں متقیانہ شان کے ساتھ نفس کی بندگی ہو رہی ہے۔ اس لئے ایک مردِ حق کے مل جانے کی امید پر اُن جگہوں میں ہاتھ نہ ڈال دیجئے جہاں پچاس فتنے بھڑک اٹھنے کے لئے تیار ہوں۔

(۳) بڑے بڑے آستانوں سے ذرا دور دور رہ کر تبلیغ فرمائیے۔ اِن کے حمیٰ کے قریب اگر آپ جائیں گے تو یاد رکھیے کہ فوراً خطرے کی گھنٹی بج جائے گی۔

(۴) کوئی کارِ خیر اگر یہ حضرات کر رہے ہوں تو اس میں جہاں تک ممکن ہو دل کھول کر حصہ لیجیے، یا کم از کم تعریف کیجئے، اور حتی الامکان مین میکھ نکالنے سے قطعی پرہیز کیجئے۔

(۵) مجھے ہر کلمۂ تحسین سے بالکل معاف رکھیئے۔ آپ لوگ تو ایک آدھ لفظ کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں اور مجھے مدتوں اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے حتیٰ کہ اپنے ہر کی ٹوپی تک بچانی مشکل ہو جاتی ہے آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مذہبی دنیا میں "ساری حمد خاص واسطے ان حضرات کے" ہے۔ بے دین سیاست کے لیڈروں کی حمد و ثنا جتنی بھی ہو جائے مضائقہ نہیں، بلکہ ان میں سے کوئی بہت زیادہ مقبول ہو جائے تو وہ خود ان حضرات کی زبانوں سے بھی مبالغہ آمیز حمد کا مستحق ہو جاتا ہے لیکن دین کی راہ سے جو شخص آئے اور ان آستانوں کا پروانہ لے کر نہ آئے اس کے حق میں ایک ادنیٰ سے ادنیٰ کلمۂ تعریف بھی ان کے دلوں پر تیر کا سا کام کرتا ہے! ان کی اس کمزوری کا لحاظ کر کے اگر آپ لوگ اس طرح کے کلمات زبان سے نکالنا بالکل بند کر دیں تو یہ میرے حق میں بھی بہتر ہے اور اس تحریک کے حق میں بھی۔ میں خدا کے فضل سے کسی تعریف کا

حاجتمند نہیں ہوں۔ جو کچھ کر رہا ہوں اپنے اندرونی احساسِ فرض کی بنا پر کر رہا ہوں۔ لوگوں کی تعریف کے بغیر بلکہ مذمت کے باوجود انشاء اللہ اپنا کام اسی طرح کرتا رہوں گا۔

(۶) میری ذات پر جو حملے کئے جائیں ان کی مدافعت آپ لوگوں کے ذمے نہیں ہے۔ اگر میرے منع کرنے کے باوجود آپ لوگ اس سے باز نہ رہ سکیں تو براہِ کرم اس معاملے میں حدِ اعتدال سے بھی کچھ کم ہی پر اکتفا کریں۔ زیادہ سے زیادہ بس اس قدر کافی ہے کہ اگر کوئی الزام مجھ پر لگایا جائے یا کوئی علمی اعتراض مجھ پر ہو تو اپنے علم کی حد تک اس کی تردید کر دیں، یا مجھ سے اس کی حقیقت پوچھ لیں اور اس کا جواب دے دیں۔ باقی رہی میری تذلیل و تحقیر، تو اس پر میرے کسی دوست یا رفیق کو برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ اسے میں پہلے ہی ہر ایک کے لئے معاف کر چکا ہوں۔ اور ہمارے موجودہ دور کے بزرگانِ دین کے لئے تو وہ آپ سے آپ مباح ہے خواہ کوئی اسے معاف کرے یا نہ کرے۔ وہ چاہے کتنے ہی صریح اور رکیک الفاظ میں دوسروں کو جاہل، احمق، گمراہ اور ہادمِ دین کہہ دیں، قابلِ مواخذہ نہیں۔ البتہ دوسرا اگر ان کی کسی بڑی سے بڑی غلطی پر بھی ٹوک دے، خواہ کتنے ہی ادب و احترام کے ساتھ ٹوکے، وہ تنقیص اور تضحیک کا مجرم ہے۔ اس کا مستقل زخم ان کے شاگردوں اور مریدوں کے دلوں پر لگ جاتا ہے اور مدت العمر رستا رہتا ہے۔ یہ عالی ظرف لوگ ہیں، ان کی کسی بات پر بُرا نہ ماننا چاہیے۔

یہ نصیحتیں میں صرف اس لئے کرتا ہوں کہ ہمیں جہاں تک ممکن ہو فتنوں سے بچ کر چلنا چاہیے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ان حضرات کی مخالفت سے کسی بڑے نقصان تو درکنار، کسی قسم کے لحاظ نقصان کا بھی خوف نہیں ہے۔ بلکہ ان کی مخالفت ایک پہلو سے ہمارے لئے مفید بھی ہے۔ اپنی تحریک کے اس دورِ توسیع میں ہمیں سخت اندیشہ ہے کہ کم فہم، ضعیف الاخلاق، اور پست ہمت لوگوں کی ایک بڑی تعداد، جو فی الواقع ہمارے کام کی نہیں ہے، محض ایک سطحی مذہبی رجحان کی بنا پر کہیں ہمارے ساتھ شامل نہ ہو جائے۔ ہمارے پاس ان کے روکنے کا کوئی ذریعہ

نہیں ہے، کیونکہ جو شخص ہمارے مقصد سے اتفاق ظاہر کر رہا ہو اور خود ساتھ دینے کا خواہش مند ہو اسے آخر ہم کیا کہہ کر روک دیں۔ ہماری اس مشکل کو اللہ کے فضل سے ان حضرات کی بروقت مخالفت نے حل کر دیا ہے۔ جو لوگ درحقیقت ہمارے کام کے ہیں وہ تو انشاء اللہ اس کی وجہ سے زیادہ ہماری طرف توجہ کریں گے۔ اور جو بیکار رہیں، یا ہمارے لئے اُلٹے سبب ضعف بن سکتے ہیں انہیں یہ حضرات روکے کھڑے رہیں گے تاکہ ہمارا کام زیادہ اچھی طرح چل سکے۔ ممکن ہے کہ کام کے آدمی بھی کچھ ان کے روکے رک جائیں۔ مگر میں امید رکھتا ہوں کہ ان کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہ ہو گی جس کے لئے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت ہو۔ اُن پر بھی دیر سویر حقیقت کھل کے رہے گی اور وہ ایک صحیح کام کو سامنے ہوتے دیکھ کر زیادہ مدت تک اس سے الگ پڑے نہ رہ سکیں گے۔

(ا۔م)

سوال:

اقامت دین کی تحریک حسب معمول قدیم نئے فتنوں سے دوچار ہو رہی ہے۔ فتویٰ بازی اور الزام تراشی جس طبقہ کا مخصوص شعار تھا وہ تو اپنا ترکش خالی کر کے ناکام ہو چکا ہے۔ اب اصحاب غرض نے ہمارے سلسلۂ دیوبند کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرنا شروع کیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں کی جماعت اسلامی نے کچھ تنقید و تبلیغ میں بے اعتدالی سے کام لیا ہو اور اس کا ردِعمل ہو وہاں کے استفتاء کے جواب میں بھی اور یہاں پاکستان کے استفتاؤں کے جواب میں بھی متعدد علماء حضرات کے فتاویٰ شائع ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ پاکستان میں اہل علم کا بہت زیادہ طبقہ دیوبند سے وابستہ ہے اور وہاں کے فتوے سے اثر پذیر ہونا بھی لازمی ہے جس کا اثر تحریک پر بھی پڑ سکتا ہے۔ لہٰذا آپ ضرور مناسب طریقے سے اس کی مدافعت کیجئے۔ ۳۲ صفحے کا ایک فتویٰ دارالافتاء سہارنپور کا شائع ہوا ہے جس کے آخر میں مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری اور مولانا اعزاز علی صاحب کا فتویٰ بھی ہے۔ رسالۂ دارالعلوم کا جو پہلا نمبر نکلا ہے اس میں حضرت مولانا گنگوہی کے پوتے حکیم محمود صاحب کا ایک طویل مکتوب ہے، اگرچہ انھوں نے تو

نہایت محتاط طریقے سے اور متانت کے رنگ میں لکھا ہے اور میرے خیال میں اندازِ تعبیر سنجیدہ ہے لیکن بہر حال انہوں نے بھی تحریک کو عوام کے لئے دینی لحاظ سے مضر بتایا ہے۔ اثر انگیز ہونے کے لحاظ سے جوشیلے اور غیر معتدلانہ فتووں سے یہ زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ کل مجھے بٹالہ کے ایک بزرگ کا ضلع .... سے خط آیا ہے جن کا حضرت گنگوہی سے تعلق تھا اور اس کے بعد سے دوسرے تمام بزرگانِ دیوبند سے تعلق رہا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "ابھی مجھے حضرت .... کا خط سہارنپور سے آیا ہے اور انہوں نے تحقیق حال کے طور پر پوچھا ہے کہ ایک واقعہ مجھے صحیح طور پر معلوم کر کے لکھو" "پاکستان سے برابر خط آرہے ہیں کہ مولانا مودودی حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا نانوتوی کا نام لے لے کر ان کی مخالفت میں تقریریں کرتا رہا ہے اور کہتا پھرتا ہے کہ ان لوگوں کو دین کے ساتھ مناسبت ہی نہ تھی اور خاص طور سے سرگودھا کی تقریروں کا حوالہ دیا ہے کہ وہاں نام لے کر یہ مخالفت کی گئی"۔ بٹالوی بزرگ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ کیا واقعہ کیا ہے میں نے انہیں جواب دے کر تردید کر دی ہے کہ یہ محض افترا ہے، اور خود سہارنپور بھی حضرت ..... کو خط لکھ دیا ہے۔ تاہم آپ خود بھی ان الزامات کی تردید کر دیں، جواب در جواب کا سلسلہ بھی غلط ہے اور سکوتِ محض سے بھی لوگوں کے شبہات قوی ہو جاتے ہیں، اس طرح اصل مقصد یعنی تحریکِ اقامتِ دین کو نقصان پہنچتا ہے علی الخصوص حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب، حضرت مولانا محمد طیب صاحب، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، حضرت مولانا احمد سعید صاحب، حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، مولانا حافظ عبداللطیف صاحب سے خط و کتابت کیجئے! انھیں مشورہ دیں کہ اگر میرے متعلق یا جماعت کے متعلق کوئی استفتاء آپ کے سامنے آئے تو جواب دینے سے پہلے آپ مجھ سے اصل حقیقت معلوم کر لیا کریں۔

جواب :

آپ کے مخلصانہ مشوروں کا بہت شکر گزار ہوں۔ ممکن تھا کہ میں ان مشوروں پر عمل بھی کرتا، لیکن اتفاق کی بات کہ آپ کا عنایت نامہ ملنے کے دوسرے ہی روز ایک صاحب نے مجھے مفتی

سعید احمد صاحب کا مفصل فتویٰ جو "کشفِ حقیقت" کے نام سے چھپا ہے بھیج دیا اور اس کے ساتھ دو تین اور اشتہار بھی بھیجے جن میں مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی، مولانا اعزاز علی صاحب اور مفتی مہدی حسن صاحب کے فتوے درج تھے۔ ان تمام فتووں کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی۔ اب یہ حضرات اس مقام سے گزر چکے ہیں جہاں ان کو خطاب کرنا مناسب اور مفید ہو۔ سب سے زیادہ افسوس مجھے مولانا کفایت اللہ صاحب پر ہے، کیونکہ میں ۳۲ سال سے ان کا نیاز مند ہوں اور ہمیشہ ان کا احترام کرتا رہا ہوں۔ افسوس کہ انھوں نے جماعتی عصبیت میں آنکھیں بند کر کے یہ فتویٰ تحریر فرما دیا۔ یہ بہت برا توشۂ آخرت ہے جو انھوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں اپنے ساتھ لیا ہے۔ باقی رہے دوسرے حضرات تو ان کے فتوے پڑھ کر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ جس وقت یہ فتوے لکھے جا رہے تھے اس وقت خدا کا خوف اور آخرت کی جواب دہی کا احساس شاید ان کے قریب بھی موجود نہ تھا۔ خصوصاً مفتی سعید احمد صاحب کے فتووں میں تو صریح بددیانتی کی بدترین مثالیں پائی جاتی ہیں جنھیں دیکھ کر گھن آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ان حضرات کے ساتھ بڑا حسنِ ظن رکھتا تھا، مگر اب ان کے یہ فتوے دیکھ کر تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ بریلوی طبقہ کے فتوے باز و کافر ساز مولویوں سے ان کا مقام کچھ بھی اونچا نہیں ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں اس قسم کی تحریروں کا جواب کبھی نہیں دیا کرتا، اس لئے یہ اندیشہ نہ فرمائیں کہ ان فتووں کے جواب میں یہاں سے کچھ لکھا جائے گا اور بات بڑھے گی لیکن اس کے ساتھ میرا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ جو مجھے ٹھوکر مارے میں اس کے آگے سر جھکا دوں۔ یہ طریقہ نہ اس کام کی عزت کے مطابق ہے جسے میں کر رہا ہوں، اور نہ اس طریقے سے فی الواقع دین ہی کی کوئی مصلحت پوری ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ اگر دیانت اور سچائی کا ہتھیار لے کر حملہ آور ہوتے اور مجھ میں یا جماعت اسلامی کی تحریک و نظام میں کوئی ایسی خرابی بتاتے جو فی الواقع ان کے دلائل سے ثابت ہوتی تو میں یقیناً ان کے آگے جھکتا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے اپنی اصلاح کرتا، لیکن انھوں نے ہتھیار جھوٹ کا استعمال کیا ہے اور حملہ آور ہونے میں دنائت کی راہ اختیار کی ہے، اس لئے

میں ان کے ساتھ وہی طریقہ اختیار کروں گا جو ایک شریف آدمی کو کرنا چاہیے۔ یعنی اذا مرّوا باللغو مرّوا کراما۔

اس میں شک نہیں کہ دیوبند اور سہارنپور کے ان فتووں کا ان لوگوں پر برا اثر پڑے گا جو ان دونوں مراکزِ علمی سے وابستہ ہیں لیکن سنۃ اللہ کے مطابق آزمائش ضروری ہے، اور اب اس پورے دیوبندی و مظاہری گروہ کے لئے آزمائش کا وقت آگیا ہے۔ دیکھنا ہے کہ ان میں سے کتنے لوگ حق پرست ہیں اور کتنے اشخاص پرست! جو حق پرست ہیں وہ انشاءاللہ ہمارے ساتھ رہیں گے اور آئندہ بھی ہمارے ساتھ آتے رہیں گے، اور جو اشخاص پرست ہیں اور جماعتی عصبیت میں مبتلا ہیں وہ ہم سے الگ ہو جائیں گے اور آئندہ بھی ہمارے ساتھ نہ چلیں گے۔ ہمیں صرف پہلے گروہ ہی کی ضرورت ہے، دوسرے گروہ سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ وہ ہٹ جائے گا تو ہم خدا کا شکر ادا کریں گے اور آئندہ ہم سے بے تعلق رہے گا تو مزید شکر کریں گے۔

حکیم محمود صاحب گنگوہی کا مضمون ایک واسطے سے ترجمان القرآن میں چھپنے کے لئے آیا ہے اور وہ مع جواب شائع کیا جا رہا ہے۔ آئندہ بھی اگر اس گروہ کے کوئی صاحب مجھ پر یا جماعتِ اسلامی پر کوئی علمی تنقید فرمائیں گے تو اسے بلا تامل شائع کیا جائے گا اور قابلِ جواب باتوں کا جواب بھی دے دیا جائے گا۔ (ا۔م)

اعتراضات بلا ادنیٰ تحقیق

سوال :-

آپ کی کتابوں کی بعض باتوں پر مجھے شک ہے۔ اس سلسلے میں چند سوالات بھیج رہا ہوں۔ ان کے جواب دے کر مطمئن کریں :

۱۔ آپ قضا و قدر کو جزوِ ایمان نہیں سمجھتے جیسا کہ آپ کی مندرجہ ذیل تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ "ہر چند میرے نزدیک مسئلہ قضا و قدر جزوِ ایمان نہیں ہے" (مسئلہ جبر و قدر ص ۵)۔ لیکن علمائے دین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ جزوِ ایمان ہے۔ جیسا کہ آتا ہے : اٰمنت باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاٰخر والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ والبعث بعد الموت۔

۲۔ آپ نے رسالہ تجدید و احیائے دین میں فرمایا ہے "نماز ایک ٹریننگ ہے، اصلی عبادت نہیں ہے، بلکہ اصلی عبادت کے لئے تیار کرتی ہے۔" یہی عقیدہ علامہ عنایت اللہ المشرقی رکھتے ہیں جو کہ اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ جواب میں بتلائیے کہ نماز اصلی عبادت کیوں نہیں ؟

۳۔ حضرت امام مہدی علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور یا نزول کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے ؟

۴۔ کیا مسیح اور مہدی ایک ہی وقت میں نازل ہوں گے، یا علیحدہ علیحدہ وقتوں میں تبلیغ اسلام کریں گے ؟

۵۔ کیا امام مہدی اور مسیح دونوں ایک ہی وجود میں نازل ہوں گے بلکہ علیحدہ علیحدہ وجود میں ؟

۶۔ اگر وہ ایک ہی وقت میں نازل ہوں گے تو وہ اپنا امیر کس کو بنائیں گے ؟ ان میں کون ایک کی بیعت کرے گا اور کیوں ؟

۷۔ کیا مسیح نبی اللہ ہوں گے ؟ اگر ایسا ہے تو ان پر وحی ہونا لازم ہے یا نہیں ؟ اور وہ کس عقیدہ کی تبلیغ کریں گے ؟ کیا اسلام کی یا عیسائیت کی ؟[1]

[1] خدا کے نازل کئے ہوئے دین کی کوئی قسم عیسائیت نام کی نہیں ہے۔ عیسائیت تو اس گروہ کے تحریف کردہ مذہبی نظام کا نام ہے جو مسیح علیہ السلام پر ایمان لانے کا مدعی بن کے اٹھا۔ (نائب مدیر)

۸۔ مسیحؑ کی حیات و وفات کے متعلق آپ اپنا عقیدہ قرآن و حدیث کی روشنی میں ظاہر کریں۔
اسی طرح نزول و صعود کے متعلق ہمیں آپ کی تحریروں سے شبہ پڑتا ہے کہ مسیحؑ اور مہدی کے آپ منکر ہیں؟

جواب کو تحریر یا ترجمان القرآن میں شائع فرما دیں تو زیادہ بہتر ہو گا![1]

جواب:۔

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ آپ کے سوالات پر کچھ عرض کرنے سے پہلے میں آپ کو یہ نصیحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اول تو اپنی دنیا و عاقبت کی فکر چھوڑ کر دوسروں کے خیر و شر کی کھوج میں پڑنا ہی کوئی معقول کام نہیں ہے، تاہم اگر آپ کو ایسا ہی کچھ شوق ہے کہ دوسروں کے عقائد کی ٹوہ لیتے پھریں یا کچھ ایسی ضرورت لاحق ہو گئی ہے کہ دوسروں کے متعلق رائے قائم کریں تو کم از کم آپ کو یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی شخص کے متعلق کوئی اچھی یا بری رائے تحقیق کے بغیر قائم کرنا بہت بری بات ہے۔ آج کل بہت سے پیشہ ور لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو خواہ مخواہ کسی فائدے کے لالچ کی بنا پر یا محض بغض و حسد کی بنا پر دوسروں کو بدنام کرنے کے لئے طرح طرح کے اشتہارات شائع کرتے ہیں اور ان میں ہر قسم کی غلط باتیں دوسروں کی طرف منسوب کر کے خلق اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان اشتہارات کو دیکھ کر اور ان کے غلط حوالوں کو پڑھ کر کسی شخص کے متعلق رائے قائم کرنے کے بجائے آپ کو خود وہ اصل کتابیں پڑھنی چاہئیں جن میں اس شخص نے اپنے خیالات بیان کئے ہیں۔

اس نصیحت کے بعد آپ کے سوالات کے مختصر جوابات عرض کرتا ہوں:۔

۱۔ آپ نے میری کتاب مسئلۂ جبر و قدر کے جس فقرے کا حوالہ دے کر مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ تم قضا و قدر کو جزوِ ایمان نہیں سمجھتے وہ فقرہ میری عبارت کا نہیں ہے بلکہ اس شخص کی عبارت کا ہے

[1] یہ سوالات جماعت احمدیہ کے ایک طالب علم کی طرف سے موصول ہوئے ہیں۔ (نائب مدیر)

جس کے سوالات کے جواب میں میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ آپ کے اس سوال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو آپ نے میری اس کتاب کو خود نہیں پڑھا، یا پھر آپ اتنا بھی نہیں جانتے کہ ایک شخص اپنی کسی تحریر کے درمیان جس عبارت کو حاشیہ چھوڑ کر واوین کے درمیان نقل کرتا ہے وہ اس کی اپنی عبارت نہیں ہوتی بلکہ دوسرے شخص کی عبارت ہوا کرتی ہے۔ اگر آپ نے یہ کتاب خود نہیں پڑھی ہے بلکہ کہیں سے سن سنا کر اس فقرے کے حوالے سے مجھ پر ایک الزام چسپاں کر دیا ہے تو آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ یہ حرکت کر کے آپ کیسی سخت بے انصافی کے مرتکب ہوئے ہیں، اور اگر آپ نے اس کتاب کو خود پڑھا ہے اور پھر بھی آپ یہ نہیں سمجھ سکے کہ جس عبارت کا ایک فقرہ آپ نقل کر رہے ہیں وہ میری عبارت نہیں، بلکہ اس سائل کی عبارت ہے جس کا جواب دینے کے لئے میں نے اسے نقل کیا ہے، تو آپ فرمائیں کہ اس قابلیت اور سمجھ بوجھ کے آدمی کو آخر کیا ضرورت پڑی ہے کہ اتنے بڑے بڑے مسائل کے متعلق دوسروں کے عقائد کی صحت وعدمِ صحت کا فیصلہ کرنے بیٹھ جائے۔

۲۔ سوال نمبر ۲ میں آپ نے میرے رسالہ "تجدید و احیائے دین" کے حوالے سے جو ادھورا فقرہ نقل کیا ہے وہ تجدید و احیائے دین میں نہیں ہے، بلکہ میری ایک دوسری کتاب "اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر" میں ہے۔ اس غلط حوالے سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ آپ نے میری کوئی کتاب بھی نہیں پڑھی ہے بلکہ میرے خلاف پروپگنڈہ کرنے والوں سے کچھ سن سنا کر اپنی یہ فردِ قراردادِ جرم تصنیف کر ڈالی ہے۔ پھر آپ کا یہ ارشاد کہ "یہی عقیدہ علامہ عنایت اللہ خان المشرقی بھی رکھتے ہیں" ـــــ یہ راز منکشف کرتا ہے کہ آپ نہ مشرقی صاحب کے متعلق کچھ جانتے ہیں اور نہ میرے متعلق۔ براہِ کرم میری کتاب "اسلامی عبادات" کو کہیں سے حاصل کر کے خود پڑھیے۔ اس میں ص۲ سے ص۱۳ تک کی عبارات پڑھنے سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ مشرقی صاحب کیا کہتے ہیں۔

۳۔ آپ کے سوالات نمبر ۳، نمبر ۴، نمبر ۵، نمبر ۶ اور نمبر ۷ کا جامع جواب یہ ہے:

ظہورِ مہدیؑ اور نزولِ مسیحؑ کے بارے میں کثرت سے جو احادیث مروی ہیں اُن سب کو جمع کرنے

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام مہدیؑ کا ظہور اور مسیح ابن مریم علیہ السلام کا نزول دونوں ایک ہی زمانے میں ہوں گے۔ یہ الگ الگ شخصیتیں ہوں گی۔ مسلمانوں کے امیر و امام مہدی علیہ السلام ہی ہوں گے۔ مسیح ابن مریم علیہ السلام اس وقت ایک مستقل صاحبِ شریعت نبی کی حیثیت سے نہ ہوں گے بلکہ شریعتِ محمدیؐ کے متبع ہوں گے اور مہدی علیہ السلام کے پیچھے نماز ادا کریں گے۔

۴۔ آپ کے آٹھویں سوال کا جواب یہ ہے کہ مسیحؑ کی حیات و وفات کے متعلق میں اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" میں وضاحت کے ساتھ لکھ چکا ہوں۔ براہِ کرم سورۂ آلِ عمران رکوع ۶، اور سورۂ نسآ رکوع ۲۲ کے حواشی پڑھ لیجیے۔ آپ کا یہ ارشاد کہ "تمہاری تحریروں سے شبہہ پڑتا ہے کہ تم مسیحؑ و مہدیؑ کے منکر ہو" حوالے کا محتاج ہے۔ آپ کی بڑی عنایت ہوگی اگر میری ان تحریروں کی نشان دہی فرمائیں جن سے آپ نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ نیز اگر مضائقہ نہ ہو تو یہ بھی ساتھ ہی فرما دیں کہ وہ تحریریں آپ نے خود پڑھی ہیں یا کسی سے آپ نے یہ باتیں سن کر لکھ دیں۔

آپ بُرا نہ مانیں اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ درحقیقت آپ کے سوالات جواب دینے کے لائق نہ تھے مگر ان کا جواب صرف اس لئے دے رہا ہوں اور رسالہ ترجمان القرآن میں بھی اسی غرض کے لئے ان کو شائع کر رہا ہوں کہ اُن غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جو بعض غرض پرست علماء اپنی افترا پردازیوں سے سادہ لوح عوام کے دلوں میں پیدا کر رہے ہیں۔ (ا۔م)

چند دلچسپ سوالات

سوال:-

"حسبِ ذیل استفسارات[1] پر روشنی ڈال کر بے پایاں شکریہ کا موقع دیں:

---

[1] یہی سوالات کچھ لفظی تصرف کے ساتھ جماعت اسلامی کے متعدد رفقا کو موصول ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک منصوبہ بندی کے ساتھ یہ کام ہو رہا ہے۔ (نائب مدیر)

۱۔ اگر آپ کی جماعت پاکستان میں نہ آجاتی تو تحریکِ اسلامی کے ظہور پذیر ہونے یا بڑھنے کے امکانات کا خاتمہ ہوجاتا۔ کیا آپ اس خیال سے متفق ہیں؟

۲۔ پنچایتی نظام اگر کسی جماعت کے امیر کو "صالح" نمائندہ تجویز نہیں کرسکتا تو اس جماعت کے افراد کیونکر صالح قرار دیئے جاسکتے ہیں؟

۳۔ ایک شیعہ جو (خلفائے ثلٰثہ کی حکومت کو غیر اسلامی قرار دیتا ہے) اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے آپ کی تحریک میں شامل ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۴۔ کیا ایک صالح نمائندہ اپنے حق میں ووٹ ڈال سکتا ہے۔ شرعی دلیل کیا ہے؟

۵۔ آپ کے تجویز کردہ نظام پنچایت میں اسمبلی سے باہر اور اندر حلقوں اور عہدوں کی بھرمار اور سر جوڑ کر بیٹھنے کا طریق خلافتِ راشدہ کے زمانے میں موجود تھا؟ یا خلیفۂ وقت عوام کے لئے از خود نمائندے نامزد کیا کرتا تھا؟

۶۔ ہندوستان میں کفر و ارتداد کی مہم تیز ہے۔ کیا ان حالات میں پاکستان کا فرض نہیں کہ وہ بزورِ شمشیر ہندوستان پہ قابض ہوکر آپ کی صالحانہ قیادت کی روشنی میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لے آئے؟ اس صورت میں کیا موجودہ مالی اور اقتصادی معاملات اسلامی علم بلند کرنے کے راستے میں کبھی روک تو ثابت نہیں ہوسکتے؟

۷۔ آپ وحی والہام کے مدعی نہیں ہیں بلکہ ریاستِ اسلامیہ میں آپ کے لحاظ سے اب وحی و الہام کی گنجائش تک باقی نہیں ہے۔ ان حالات میں آپ محض چند دلائل سے خود کیونکر مطمئن ہیں کہ آپ کی تحریک ہی صحیح معنوں میں دین کے مزاج کے مطابق ہے اور انقلاب قیادت کا حقیقی تصور آپ کی جماعت کے بغیر نہیں مل سکتا؟ ممکن ہے دوسری جماعتیں صحیح مسلک پر قائم ہوں اور آپ ہی کو ان کی بابت غلط فہمی پڑ رہی ہو۔

جواب:

آپ کے سوالات کا انداز دیکھ کر طبیعت نے کچھ انقباض محسوس کیا تھا مگر جب اس مقام کا نام پڑھا جہاں سے یہ خط آپ تحریر فرما رہے ہیں[۵] تو اتنی معقولیت اور متانت بھی غنیمت نظر آئی جو آپ کے

۵؎ مقام کا نام "ربوہ" ہے۔

استفسارات میں پائی جاتی ہے۔ خدا کرے کہ اس میں کچھ اور اضافہ ہو۔

آپ کے سوالات کا مختصر جواب حسبِ ذیل ہے:

۱۔ جماعتِ اسلامی، پاکستان میں کہیں سے آئی نہیں بلکہ یہاں پہلے سے موجود تھی، البتہ اس کا مرکز یہاں ضرور منتقل ہوا ہے، جس طرح متعدد دوسری جماعتوں کے مرکز منتقل ہوئے ہیں۔ ہمیں ایسا کوئی دعویٰ نہیں ہے کہ اس جماعت کے بغیر یہاں تحریکِ اسلامی کے ظہور پذیر ہونے یا بڑھنے کے امکانات کا خاتمہ ہو جاتا۔ ہم جو کچھ سمجھتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد اس مملکت کو عملاً اسلامی مملکت بنانے کے لئے ایک ایسی تحریک اور جماعت کا موجود ہونا ضروری تھا جو پہلے سے منظم اور طاقتور ہو چکی ہو اور الحمدللہ کہ اس ضرورت کو جماعتِ اسلامی نے بڑی حد تک پورا کر دیا ہے۔ اگر یہ جماعت پہلے سے منظم نہ ہو چکی ہوتی تو اس امر کی بہت کم توقع تھی کہ فسق و ضلالت کی طاقتیں یہاں نئے سرے سے کسی تحریک کو اٹھنے اور کسی جماعت کو منظم ہونے کا موقع دیتیں۔

۲۔ کیا آپ کو کسی ذریعے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ کسی جماعت کے امیر کا نام کسی پنچایت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا یا کیا گیا اور اسے غیر صالح قرار دے کر رد کر دیا گیا؟ اگر ایسی کوئی اطلاع آپ کو پہنچی ہے تو ضرور مجھے بھی اس سے مستفید فرمائیں، اور اگر یہ محض ایک قیاس آرائی ہے جو آپ نے اپنی جگہ بیٹھ کر فرمائی ہے تو آپ کو مجھ سے سوال کرنے کے بجائے اپنے اندازِ فکر کی اصلاح کرنی چاہیے۔ علم و واقفیت کے بغیر آپ کا اس طرح کے قیاسات قائم کرنا بجائے خود ہی کوئی بھلا کام نہ تھا، کجا کہ آپ خود اُس شخص کے سامنے اپنے اِس قیاس کو پیش فرما رہے ہیں جسے حقیقتِ حال معلوم ہے۔

۳۔ جماعتِ اسلامی کا عقیدہ اور نصب العین جماعت کے دستور میں لکھ دیا گیا ہے۔ ہر وہ شخص جو اس عقیدے اور نصب العین کو قبول کر کے نظمِ جماعت کی پابندی کا عہد کرے، جماعت میں داخل ہو سکتا ہے۔

۴۔ ایک صالح نمائندے کا خود اپنے حق میں ووٹ ڈالنا اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے مگر موجودہ زمانے کے الیکشن میں خصوصاً کہ آدمی کو جن مکروہات میں چار و ناچار مبتلا ہونا

پڑتا ہے یہ بھی انھی میں سے ایک ہے، اور اس طرح کے مکروہات کی حیثیت اتنی شدید بھی نہیں ہے کہ ان کی وجہ سے انتخابات جیسے اہم کام سے علیحدہ رہنا درست سمجھا جائے۔

۵۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ ہمارے تجویز کردہ پنچایتی نظام میں حلفوں اور عہدوں کی بھرمار کہاں ہے؟ ہم صرف ایک عہد عام لوگوں سے لیتے ہیں جبکہ انھیں پنچایت کا ممبر بنائے ہیں، اور ایک عہد نمائندے سے لیتے ہیں جبکہ وہ پنچایت میں چُن لیا جاتا ہے۔ اس پر لفظ "بھرمار" کا اطلاق آخر کس طرح ہوسکتا ہے۔ خلافتِ راشدہ میں کسی طریقہ کا موجود نہ ہونا اس کے ناجائز یا غیر اسلامی ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ آپ کے پاس اس طریقے کے ناجائز ہونے کی کوئی دلیل ہو تو ارشاد فرمائیں۔ خلفائے راشدین کو اگر ایک جائز کام کی ضرورت پیش نہیں آئی تو انھوں نے اسے نہیں کیا، ہمیں ضرورت پیش آئی ہے تو ہم اسے کرسکتے ہیں۔

آپ کا یہ سوال بالکل عجیب ہے کہ کیا سر جوڑ کر بیٹھنے کا طریق خلافتِ راشدہ کے زمانے میں موجود تھا۔ آپ اس سوال پر ذرا دوبارہ غور فرمائیں، کیا یہ واقعی پوچھنے کے قابل سوال تھا؟

آپ کا یہ ارشاد کہ خلیفۂ وقت از خود عوام کے لئے نمائندے نامزد کر دیتا تھا تاریخ کے ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس زمانے میں قبائلی نظام تھا، شیوخِ قبائل آپ سے آپ اپنے قبیلے کے نمائندے ہوتے تھے، اگر الیکشن بھی ہوتا تو وہی لوگ چنے جاتے۔ اس لئے خلفاء انھی حضرات کو مشورے کے لئے طلب کر لیا کرتے تھے۔

۶۔ پاکستان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ خود اپنی حدود میں اسلامی احکام کے اجرا اور ضلالت و ارتداد کی تحریکوں کا استیصال کرے۔ اس کے بعد یہ فرض کہ وہ کسی دوسرے ملک کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لئے پہنچے، طاقت کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ طاقت ہو تو ایسا ضرور کرنا چاہیے، نہ ہو تو ایسا کرنا فرض نہیں ہے۔ کسی کافر حکومت سے خواہ وہ دشمنِ اسلام ہی کیوں نہ ہو کسی مسلم مملکت کا حسبِ ضرورت معاہدہ کرنا بھی ممنوع نہیں ہے۔ اگر یہ ممنوع ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کیوں کرتے؟

۷۔ [illegible] جو آپ کے نزدیک "محض چند دلائل" کی تعریف میں داخل ہیں اور ایک

مسلمان کے اطمینان کے لئے کافی نہیں ہیں، میں اُن ہی کے مطالعہ سے مطمئن ہوں کہ جماعتِ اسلامی کی تحریک دینِ اسلام کے مزاج کے مطابق ہے اور اگر ہم اس تحریک کے تقاضوں کے مطابق صحیح کام کر سکے تو یقیناً اس کے ذریعے سے صالح قیادت قائم ہو سکتی ہے۔ دوسری جماعتوں کے بارے میں میری جو رائے ہے، آپ چاہیں تو اسے غلط فہمی خیال کریں مگر میں دلائل کی بنا پر رائے قائم کرتا ہوں اور دلائل ہی کی بنا پر اپنی رائے سے ہٹ سکتا ہوں۔

وحی میرے نزدیک اب نہیں آسکتی۔ رہا الہام، تو وہ ضروری نہیں ہے۔ ہو تو اچھا ہے، نہ ہو تو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ہماری رہنمائی کے لئے بالکل کافی ہے۔　　(ا۔م)

پاکستان کی قومی و سرکاری زبان

سوال:

ایک صاحب کا انگریزی مضمون ارسالِ خدمت ہے جو اگرچہ مسلم لیگ کے حلقے میں ہیں لیکن اسلامی نظامِ حکومت کے لئے آواز اٹھاتے رہتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ اسلام کے منشا کے مطابق تبدیلی آئے۔ فی الحال یہ ایک خاص مسئلے پر متوجہ ہیں یعنی اپنی پوری کوشش اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ پاکستان کی سرکاری ملکی زبان بروئے دستور عربی قرار پائے۔ ان کے دلائل کا جائزہ لے کر اپنی رائے سے مطلع فرمائیے۔

محولہ بالا مضمون درج ذیل ہے:۔

"پاکستان کی قومی زبان کے مسئلہ کا فیصلہ مستقبل قریب میں ہونے والا ہے۔ میری التجا یہ ہے کہ آپ عربی زبان کے حق میں آواز بلند کرنے پر پوری توجہ صرف کریں۔ یہ معاملہ اسلام اور پاکستان کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور اگر آپ میری ان سطور کو اپنے موقر جریدے میں شائع فرمادیں تو میں بہت شکر گزار رہوں گا۔

عربی زبان کلامِ الٰہی یعنی قرآن شریف کی زبان ہے اور قرآن شریف ہی پر سارے اسلام کا دار و مدار ہے۔ اس لحاظ سے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لئے عربی سیکھنا ضروری ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب عالمِ آخرت کی زبان بھی عربی ہوگی۔ پھر اسلام کے سارے سرمایہ روایات کے علمی ماخذ عربی ہی میں ملتے ہیں۔

بجائے خود عربی دنیا کی زندہ کثیر الاستعمال اور وسیع الظرف زبانوں میں سے ہے۔ پھر عرب، مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کی تمام اسلامی حکومتوں اور بحیرۂ روم کے آس پاس یورپ کے بعض علاقوں کی بھی اکثریت کے لحاظ سے مسلم علاقے ہیں، عربی ہی سرکاری اور قومی زبان ہے۔ علاوہ بریں قرآن شریف کے واسطے سے دنیا بھر کے مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ——— مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک بشمول پاکستان ——— عربی سے فناسا ہے۔

عربی زبان بحیثیت ایک تمدنی ذریعۂ ربط کے وسیع استعداد رکھتی ہے، اور ہر قسم کی سائنٹفک، فنی اور عام اصطلاحات و مصطلحات کو اپنے اندر جذب کر سکتی ہے۔ اردو اور فارسی کو بھی اس معاملے میں بیشتر عربی کا دست نگر ہونا پڑتا ہے، جیسا کہ زاہد حسین گورنر اسٹیٹ بنک آف پاکستان نے عربی کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی دعوت دیتے ہوئے زیادہ وضاحت سے بتایا تھا۔

ساری دنیا کے مسلمانوں کا خدا ایک ہے، ان کی آسمانی کتاب ایک ہے، اور وہ بحیثیت مجموعی ملتِ واحدہ ہیں، لہٰذا بالکل اسی طرح ان کی قومی زبان بھی ایک ہی ——— یعنی عربی ——— ہونی چاہیے، چاہے وہ کئی مختلف زبانیں بولتے ہوں۔ ملتِ اسلامیہ کی ترکیب کا دارومدار ان تنوعات میں یک جہتی پیدا ہونے پر ہے۔

قراردادِ مقاصد پاکستان کے دستور کا اصل الاصول قرار پا چکی ہے۔ اس کے تحت بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے بالکل بجا طور پر مسلمانوں کے لئے قرآن کی لازمی تعلیم کی سفارش کی ہے۔ خود یہ سفارش بالکل منطقی طور پر عربی زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنائے جانے کو لازم قرار دیتی ہے۔ اس فیصلے سے پاکستان کے ہر حصے کے مسلمانوں میں ایک روحِ تازہ دوڑ جائے گی، اور

بالآخر یہ چیز پاکستان ــــــ دنیا کی عظیم ترین مسلم مملکت ــــــ کو ملت اور عالم اسلام کی سیاسی تنظیم میں شایانِ شان حصہ ادا کرنے اور ممتاز مقام حاصل کرنے کی ضامن ہو گی۔ یہ اُس صورت میں ناممکن ہے جبکہ کسی دوسری زبان کو قومی زبان قرار دیا جائے۔

سرکاری زبان کو بدلنے کا معاملہ بڑا بھاری معاملہ ہے۔ انگریزی زبان کو ہندوستان میں سرکاری زبان کی حیثیت سے اپنی جگہ پیدا کرنے میں کئی سال لگے۔ اب پاکستان کو اپنی نئی سرکاری زبان اختیار کرنے کے لیے بھی ویسی صورت پیش آئے گی ــــــ چاہے وہ کوئی سی زبان بھی ہو۔ ہمارے لئے اب قرینِ مصلحت یہی ہے کہ ہم ذرا سی دور اندیشی سے کام لیں اور اُس زبان کے حق میں فیصلہ کریں جو ہماری سرزمین کے لئے زیادہ راس آنے والی ہے اور بلحاظ نتائج بعید کے زیادہ مفید ثابت ہونے والی ہے۔

عربی زبان طباعت، سٹینوگرافی اور ٹائپ کے پہلو سے خوب اچھی طرح فروغ یافتہ سہولتیں رکھتی ہے۔ مادری زبانوں کو درکنار رکھ کر دیکھا جائے تو مسلمان عوام دوسری زبان کے مقابلے میں عربی کے لئے امتیازی جذبۂ احترام رکھتے ہیں۔ ہمیں کبھی بھی عوام کے جذبات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

پھر جبکہ مسلم ممالک ــــــ جو زیادہ تر عربی بولنے والے ہیں ــــــ کا متحدہ بلاک بنانے کی اسکیم پیشِ نظر ہے، تو پاکستان عربی کو اپنی سرکاری زبان قرار دے کر اس معاملے میں بڑا حصہ ادا کرنے کے لئے زیادہ بہتر مقام پیدا کر سکتا ہے۔ دنیا بھر کی مسلمان مملکتوں کی لنگوا فرینکا اگر کوئی زبان ہے اور ہو سکتی ہے تو وہ صرف عربی ہے۔

پھر ہر سال کی تقریب حج اسلام کی پانچ بنیادی عبادات میں سے ایک ہے جو بحیثیت ایک فریضے کے دنیا بھر کے ذی استطاعت مسلمان سرانجام دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں حج اور مسلمانوں کی دوسری ہنگامی کانفرنسوں کے موقع پر کسی دقت اور غیر ضروری خرچ کے بغیر تمام مسلمان ممالک کے درمیان خیالات و افکار کا تبادلہ اور کاروباری تعلقات کا استحکام عربی زبان جاننے ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے۔

پھر یہ کہ مصر، شام اور لبنان کے عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح ہمارے غیر مسلم ہم وطنوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا کہ پاکستان کی سرکاری زبان عربی ہو۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اردو کو عربی پر ترجیح دیں، جبکہ ان کو مغل دور میں فارسی کے خلاف اور ماضی قریب میں انگریزی کے خلاف کوئی شکایت نہ پیدا ہوئی۔

عربی زبان پاکستان کی سرکاری زبان قرار پا کر پاکستان کی علاقائی زبانوں، ان کے رسم الخط اور مستقبل میں صحیح خطوط پر ان کے ارتقا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

علاوہ بریں عربی زبان اختیار کرنے سے پاکستان بھر میں ہمارے بچوں کے لئے تعلیمی بوجھ میں نمایاں کمی آجائے گی، کیونکہ اس صورت میں ان کے لئے صرف اپنی مادری زبان کی تعلیم حاصل کرنا لازمی ہوگا، اور مزید کسی زبان کو وہ سیکھنا چاہیں تو یہ ان کا اپنا اختیاری معاملہ ہوگا۔ اردو یا کسی دوسری علاقائی زبان کو اگر پاکستان کی قومی زبان بنایا گیا تو ان کے کندھوں پر سہ گونہ بار آپڑے گا، کیونکہ عربی تو ہر حال میں مسلمان خاندانوں میں گھریلو طور پر پڑھی جائے گی۔

برعکس اس کے اگر خالص جمہوری نقطۂ نظر سے پاکستان کی زبان کا تعین کیا جائے تو پھر تو بنگالی جو پاکستان کی ۶۰ ٪ آبادی کی زبان ہے، اپنے آپ کو غور کے لئے سب سے پیش پیش رکھنے کی مستحق ہے۔ اردو ایک محدود گروہ میں بولے جانے کی وجہ سے سندھی، پنجابی اور پشتو سے زیادہ قابلِ لحاظ نہیں ہو سکتی جن کے بولنے والے اپنی بولیوں سے کچھ کم محبت نہیں رکھتے۔ اس کا لحاظ رہے کہ اردو پاکستان کے کسی صوبے میں خصوصی طور پر نہیں بولی جاتی۔ اندریں حالات عربی زبان ہی اس کا وسیلہ ہو سکتی ہے کہ ہم ہر دو خطوں کے لوگ پاکستانی وحدتِ اسلامیہ کے وسیع تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی علاقائی زبانوں کی علمبرداری سے دست بردار ہو جائیں۔"

جواب:

مسلمانوں کے لئے عربی زبان کی اہمیت ناقابلِ انکار ہے۔ ہم خود یہ چاہتے ہیں کہ عربی زبان کو نہیں بلکہ قرآن مجید کی تعلیم کو بھی ملک کی تمام درسگاہوں میں لازمی کر دیا جائے۔ ہمیں عربی کی بین الاقوامی اور بین الاسلامی اہمیت بھی معلوم ہے، اور اس کا لحاظ رکھنا بھی ہم ضروری سمجھتے ہیں۔

لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی اس بات کے لیے دلیل نہیں ٹھیرائی جاسکتی کہ پاکستان کی قومی زبان یا سرکاری زبان عربی قرار دی جائے۔ ایک ملک کی قومی اور سرکاری زبان صرف وہی زبان ہوسکتی ہے جس کو اس ملک کے عام باشندے ملک کے ہر حصے میں جانتے اور سمجھتے ہوں۔ یہ درجہ عربی کو سردست حاصل نہیں ہے، نہ یہ درجہ اسے آسانی کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر ہم ان کوششوں کو دیکھیں جو ایک صدی تک انگریزی حکومت نے ہندوستان میں اپنی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کرنے میں صرف کیں اور پھر یہ دیکھیں کہ ملک کی ۰۵۔ فی صد سے زیادہ آبادی کو وہ انگریزی سمجھنے کے قابل نہ بنا سکی تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ ہم انگریزوں سے کم از کم دس گنی زیادہ کوشش کر کے آئندہ ایک صدی میں اس لائق ہو سکیں گے کہ عربی زبان کو یہاں ایک کامیاب قومی زبان بنا دیں۔

اس کے برعکس اردو زبان کو یہ حیثیت بہت بڑی حد تک پہلے ہی سے حاصل ہے۔ جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے یہ زبان اس کے ہر حصے میں سمجھی جاتی ہے۔ اور سرحد، کشمیر، سندھ، بلوچستان اور پنجاب کے لوگ جب کبھی آپس میں ملتے ہیں یہی زبان استعمال کر کے ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرتے ہیں۔ میں نے اپنے دوروں کے سلسلے میں بلوچستان کے انتہائی سرے پر بلوچ دیہاتیوں کے سامنے اردو میں تقریر کی اور پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ تقریر کو بلا تکلف سمجھ گئے۔ میں نے ان پڑھ سندھیوں کے سامنے بھی تقریر کی ہے، وہ بھی میری بات بآسانی سمجھتے رہے۔ صوبہ سرحد میں تو آزاد قبائلی علاقوں تک کے لوگ اچھی طرح اردو سمجھ اور بول لیتے ہیں۔ رہا مشرقی پاکستان تو مجھے ابھی تک براہِ راست وہاں کے حالات کا علم نہیں ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ مغربی پاکستان کے برابر نہ سہی، تاہم وہاں کے بھی عام باشندے انگریزی اور عربی دونوں کی بہ نسبت اردو سے زیادہ آشنا ہیں۔ ایک اردو بولنے والا آدمی مشرقی بنگال کے کسی حصے میں بھی اُس قدر اجنبی نہیں ہو سکتا جس قدر اجنبی ایک ایسا شخص ہو سکتا ہے جو صرف انگریزی یا صرف عربی جانتا ہو۔ اور اسی طرح مشرقی بنگال کا ایک عامی آدمی مغربی پاکستان آ کر جس زبان کے ذریعے سے یہاں کے عوام سے بات چیت کر سکتا ہے وہ نہ انگریزی ہے نہ عربی، بلکہ صرف اردو ہے۔

یہ حیثیت اردو کو اس وقت بھی حاصل ہے جبکہ یہ زبان ابھی سرکاری زبان نہیں قرار پائی ہے۔ اب اگر اسے سرکاری زبان قرار دے کر اس کی ترویج کے لئے کوشش کی جائے تو ہم بہت کم محنت کے ساتھ، بہت کم وقت میں اسے اتنا عام کر سکتے ہیں کہ یہ ہماری اُن تمام ضرورتوں کو بآسانی پورا کر سکتی ہے جو ایک قومی اور سرکاری زبان سے وابستہ ہوتی ہیں۔

مجھے صاحب مضمون کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ اگر پاکستان کی سرکاری زبان کا انتخاب محض جمہوری بنیاد پر کرنا ہو تو پھر بنگالی کا حق مرجح ہے کیونکہ یہ ۶۰ بزر پاکستانیوں کی زبان ہے محض سروں کو گن کر کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا جمہوریت نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ بنگالی ہو یا پشتو یا پنجابی یا سندھی، ان میں سے کسی زبان کو بھی اس حالت میں قومی زبان کیسے بنایا جا سکتا ہے جبکہ اس زبان کے بولنے اور سمجھنے والے صرف اپنے علاقوں تک ہی محدود ہیں اور دوسرے علاقوں کے لئے یہ زبانیں اتنی ہی اجنبی ہیں جتنی دنیا کی کوئی دوسری زبان ہو سکتی ہے۔ ہم جس زبان کو قومی زبان بنانا چاہتے ہیں وہ پاکستان کے کسی حصے کی بھی مادری زبان نہیں ہے مگر پاکستان کے ہر حصے میں کم و بیش عام لوگ اس سے واقف ہیں اور مختلف صوبوں کے عوام باہمی میل جول میں اس کو استعمال کرتے اور کر سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں نہ بنگالی کو ترجیح دی جا سکتی ہے، نہ پنجابی کو، نہ سندھی یا پشتو یا بلوچی کو۔ اگر سر شماری پر ہی فیصلہ کرنا ہے تو اس لحاظ سے دیکھئے کہ کس زبان کے سمجھنے والے پاکستان میں سب سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔

بلاشبہ یہ مشکل بہت وزن رکھتی ہے کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو بنگلہ زبان مقامی زبان کی حیثیت سے سیکھنی ہو گی، عربی دینی زبان کی حیثیت سے، انگریزی بین الاقوامی ضرورتوں کے لئے اور پھر اردو سرکاری زبان کی حیثیت سے۔ ہم اس معاملے میں ان کی مشکلات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن یہی مشکل سندھیوں اور پشتو اور بلوچ علاقے کے لوگوں کو بھی پیش آئے گی۔ اس کا بار تنہا مشرقی پاکستان کے لوگوں ہی پر نہیں پڑے گا۔ اب ہمیں موازنہ کر کے دیکھ لینا چاہیے کہ عربی کو بالکل نئے سرے سے قومی زبان کی حیثیت سے رائج کرنا زیادہ مشکل ہے یا اُس زبان کو رائج کرنا جو پہلے بھی اس ملک کے

ہر گوشے میں کافی پھیلی ہوئی ہے۔ ان دونوں میں سے جو مشکل کم ہو اسے اختیار کر لیجیے۔
میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مشرقی اور مغربی پاکستان جیسے دور دراز خطوں کے درمیان اسلام کے بعد ایک اور اتحادی رشتہ بھی اردو زبان کی شکل میں مہیا کر رکھا ہے اس نعمت کی قدر نہ کرنا ایک طرح کی ناشکری ہے۔ (ا۔م)

سوسائٹی میں انسان کا فطری مقام

سوال :

فرد اور سوسائٹی کے باہمی تعلقات کی نسبت مندرجہ ذیل خیال اسلامی نقطۂ نظر سے کہاں تک صحیح ہے؟
"شہد کی مکھیوں، چیونٹیوں اور دیمک کے برعکس انسان معاشرے میں زندگی گزارنے کے لئے نہیں بنایا گیا ہے۔ وہ بڑی حد تک زیادہ حد تک ایک فرد ہے۔ بدرجۂ آخر یوں سمجھ لیجئے کہ وہ گلوں میں بٹ کر جینے کی جبلت رکھتا ہے۔ یہی راز ہے فرد اور معاشرے کے غیر مختتم تصادم کا! کوئی مذہب عدم توافق کی اس گرہ کو کھولنے پر قادر نہیں ہے کیونکہ یہ گرہ کھلنے والی ہے ہی نہیں! کیا خود قرآن نے نہیں کہا کہ ہم نے انسان کو احسنِ تقویم پر پیدا کیا (۹۵۔۴) ------ اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ------ کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا (البلد ۴)۔ میری رائے میں ان آیات کی بہترین تاویل یہ ہے کہ ایک مشین ------ نظامِ جسمانی ------ کی حیثیت سے آدمی اشرف المخلوقات ہے، لیکن معاشرے کا رکن ہونے کی حیثیت سے وہ معاشرے کے ساتھ ہمہ وقت متصادم رہنے والا ہے۔"

جواب :

آپ نے جس خیال پر مجھ سے اظہارِ خیال کی فرمائش کی ہے اس کے مصنف نے فرد اور جماعت کی کشمکش کے پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے یا بالفاظ دیگر ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے صحیح رُخ (APPROACH) اختیار نہیں کیا ہے۔ اس نے انسان کو حیوانات کی ایک قسم فرض کر کے یہ طے کرنے کی کوشش کی ہے کہ

تنظیم پسند حیوانات اور گلہ پسند حیوانات کے درمیان انسان کا صحیح مقام کیا ہے۔ حالانکہ یہ زاویۂ فکر اس مسئلے کی طرف پیش قدمی کرنے کے لئے سرے سے کوئی نقطۂ آغاز ہی نہیں ہے۔ حیوانات اور انسان کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ حیوانات کوئی ذی اختیار مخلوق نہیں ہیں جو مشاہدات اور تجربات پر غور و فکر کر کے اپنی زندگی کا راستہ خود تجویز کر لیے ہوں آیا۔ وہ سراسر جبلت کے تابع ہیں۔ شہد کی مکھیوں نے منظم ہیئتِ اجتماعی خود اختیار نہیں کی ہے، نہ پیہم تجربات سے بتدریج اس تنظیم کو ترقی دی ہے، بلکہ یہ تنظیم ان کی جبلت میں ودیعت کر دی گئی ہے اور وہ جب سے وجود میں ہیں یکسانی کے ساتھ اسی تنظیمی شکل میں رہتی چلی آرہی ہیں۔ یہی حال گلہ پسند، زوج پسند اور انفرادیت پسند حیوانات کا بھی ہے کہ ہر ایک اپنی جبلت کے مقرر کردہ راستے پر چلا جا رہا ہے اور ان میں سے کسی نوع نے بھی تجربے اور فکر کی بنیاد پر اپنے طریقِ حیات میں ذرہ برابر کوئی رد و بدل نہیں کیا ہے۔ برعکس اس کے انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا ایک ایک فرد ذی ارادہ، ذی اختیار، صاحبِ فکر اور اخلاقی حیثیت سے شخصاً ذمہ دار واقع ہوا ہے۔ اس کی جبلت کا دائرۂ اثر بہت محدود رکھا گیا ہے۔ اس کی فطرت میں چند دواعی اور میلانات ضرور رکھ دیئے گئے ہیں مگر ان کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کوئی مخصوص راستہ تجویز کرتے ہوں اور انسان کو اسی خاص راستے پر چلنے کے لئے مجبور کرتے ہوں، بلکہ ان کی نوعیت یہ ہے کہ وہ صرف اپنے تقاضے انسان کی عقل و فکر کے سامنے پیش کرتے ہیں اور پھر انسان اپنی عقل و فکر کی مدد سے ان تقاضوں کو پورا کرنے کی صورتیں تجویز کرتا ہے۔ اس کے ساتھ انسان کو یہ قوت بھی ملی ہوئی ہے کہ وہ تجربات و مشاہدات کی مدد سے اپنی اختیار کردہ عملی صورتوں میں رد و بدل کرتا ہے اور بتدریج ان کو درست کرنے اور ترقی دینے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان نے اپنی فطرت کے تقاضوں کو سمجھ کر ایک جوڑے کی یکجائی معاشرت سے ابتدا کر کے بتدریج خاندان، قبیلے، قوم، منظم سوسائٹی، اسٹیٹ اور بین الاقوامی روابط تک اپنی زندگی کو ترقی دی۔ اور یہی وجہ ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف ممالک میں انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کے لئے بہت سے مختلف نقشے اختیار

گئے اور بار بار ان نقشوں کو وہ بدلتا اور نئے سرے سے بناتا رہا ہے۔

انسان کی اس مخصوص حیثیت پر اگر آپ غائر نگاہ ڈالیں تو اُس گتھی کو سمجھنے کے لئے آپ کو کلید مل سکتی ہے جو فرد اور جماعت کی کشمکش کی شکل میں ہم آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس گتھی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایک طرف نوعِ انسانی کا ہر ہر فرد اپنی ایک خودی رکھتا ہے جس میں تعقل ہے، ارادہ و اختیار ہے اور شخصی ذمہ داری کا احساس ہے۔ دوسری طرف اس خودی کے حامل افراد ایک ایسی اجتماعی زندگی میں شریک ہونے پر مجبور ہوتے ہیں جس کا پورا نقشہ فطرت نے خود نہیں بنا دیا ہے بلکہ فطری داعیات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں کے لوگوں نے مختلف طریقوں سے یہ نقشے خود بنائے ہیں، اور بتدریج اجتماعی تجربات اور مجموعی میلانات اور خارجی اثرات کے تحت ان نقشوں کا نشو و نما ہوتا رہا ہے۔ اس طرح لاکھوں کروڑوں افراد کی جدا جدا خودیوں کا ایسی غیر فطری اجتماعیت میں (جو بارہا اپنے بعض پہلوؤں میں خلافِ فطرت بھی واقع ہو جاتی ہے) ٹھیک ٹھیک متوازن اور متناسب طور پر نصب ہونا اور اپنی موزوں جگہ پالینا نہایت مشکل ہوتا ہے اور اسی وجہ سے وہ کشمکش پیدا ہوتی ہے جو فرد اور جماعت کے درمیان ہر جگہ برپا ہے۔ کیونکہ اس طریقے سے بنی ہوئی اور نشو و نما پائی ہوئی اجتماعیت میں افراد کی خودیاں بھی اپنی موزوں جگہ نہ پانے کی وجہ سے بے کلی محسوس کرتی ہیں، اور اجتماعی نظام بھی ان بے چین خودیوں کی انفرادی تگ و دو کے باعث مضطرب ہوتے رہتے ہیں۔ افراد کو ڈھیل ملتی ہے تو اجتماعی نظام درہم برہم ہونے لگتا ہے اور اجتماعی نظام زیادہ کس جاتا ہے تو افراد کی خودیاں یا تو مرجھانے لگتی ہیں یا بغاوت پر اتر آتی ہیں۔

یہ منجملہ اُن اہم اسباب کے ہے جن کی بنا پر انسان کے لئے وحی اور نبوت کی رہنمائی ناگزیر ثابت ہوتی ہے۔ ہزارہا برس کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ اپنے فطری داعیات اور تقاضوں کو سمجھ کر انھیں پورا کرنے کے طریقے تجویز کرنے کے لئے انسان کو تعقل، تفکر اور استقراء و اختبار کی جو طاقتیں ملی ہوئی ہیں وہ اس کام میں مددگار تو ضرور ہیں مگر اس کے لئے کافی نہیں ہیں۔

ان طاقتوں کے بل بوتے پر انسان خود اپنے لئے ایک صحیح اور معتدل و متوازن طریق زندگی نہیں بنا سکتا۔ وہ اس بات کا محتاج ہے کہ اس کا خالق اسے قانون زندگی کے بنیادی اصول دے، سعی و عمل کے حدود بتائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان مابعد الطبعیاتی حقائق کا صریح علم دے جن کی واقفیت کے بغیر ایک صحیح طریق زندگی تجویز کرنا انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ انفرادیت اور اجتماعیت کے درمیان زیادہ سے زیادہ جو توازن ممکن ہے اور افراد کی خودی کی تکمیل کے مواقع باقی رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ مستحکم جو اجتماعی نظام بنایا جا سکتا ہے وہ وہی ہے جس کے اصول اور حدود اور ضروری فروع کی طرف اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے ہماری رہنمائی کی ہے۔

قرآن مجید کی جن دو آیتوں کا آپ نے حوالہ دیا ہے ان کی تفسیر بھی میرے اوپر کے بیان سے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ بلکہ بات اور زیادہ کھل جائے اگر آپ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کے بعد یہ بھی پڑھیں کہ ثم رددناہ اسفل سافلین الا الذین آمنوا وعملوا الصلحت۔ (ا م)

سوالات متعلقہ "تفہیم القرآن"

سوال:

مندرجہ ذیل استفسارات پر روشنی ڈالیں:۔

۱۔ آپ نے تفہیم القرآن میں ایک جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ طوفانِ نوحؑ عام نہیں تھا۔ لیکن ظاہری قرائن اس بات کے خلاف ہیں۔ اوّل کشتی کس لئے بنائی گئی تھی؟ کیوں نہ حضرت نوحؑ کو ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا؟ دوم کشتی میں حیوانات میں سے ایک ایک جوڑا لینا بھی اس بات کا مؤید ہے کہ طوفان نہایت عام تھا۔ حضرت نوحؑ کی بددعا میں بھی اس عمومیت کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ہو کر رب لا تذر علی الارض من الکفرین دیارا۔

۲۔ ثانیاً آپ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ دنیا کی موجودہ انسانی نسل ان سب لوگوں کی ہے جو کہ حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ آپ نے ذریۃ من حملنا مع نوح سے اس کی دلیل اخذ کی ہے لیکن یہ صحیح نہیں، کیونکہ نوح کے ساتھ ان کے تین بیٹے بھی کشتی میں سوار تھے۔ ظاہر ہے کہ اس جگہ من حملنا مع نوح سے مراد حضرت نوحؑ کے بیٹے ہیں نہ کہ کچھ اور لوگ۔ دوسری جگہ اس کی تفسیر خود قرآن کے یہ الفاظ کرتے ہیں کہ وجعلنا ذریتہ ھم الباقین۔ کتنے کامل حصر کے الفاظ ہیں!

۳۔ سورۂ یوسف کی تفسیر میں جناب نے لکھا ہے کہ زلیخا کو حضرت یوسفؑ نے نکاح میں نہیں لیا، کیونکہ قرآن کریم سے اس عورت کا بدچلن ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن کیا حضرت لوطؑ اور حضرت نوحؑ کی ازواج کافرہ نہ تھیں؟ اگرچہ کفر کیا بدچلنی سے زیادہ شدید نہیں ہے؟ علاوہ بریں حضرت یوسفؑ کے قصے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ عقدِ نکاح کے وقت تک زلیخا مسلمان ہو چکی تھیں اور سابقہ بدچلنی سے تائب ہو گئی تھیں۔

جواب:

(۱) میں قطعیت کے ساتھ تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ طوفانِ نوحؑ عالمگیر نہ تھا۔ لیکن میرا اندازہ تاریخ و آثارِ قدیمہ کے مطالعہ کی بنا پر یہ ہے کہ طوفان صرف اس علاقے میں آیا تھا جہاں قوم نوحؑ آباد تھی۔ قرآن مجید سے اس کے خلاف یا موافق کوئی صریح بات نہیں ملتی۔

آپ کا یہ معارضہ کہ کشتی بنانے کا حکم کیوں دیا گیا؟ ہجرت کا حکم کیوں نہ دیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تک نسلِ آدم تمام روئے زمین پر نہ پھیلی تھی۔ آباد دنیا اتنی ہی تھی جس میں قوم نوحؑ آباد تھی۔ یہی آپ کے دوسرے معارضات کا بھی جواب ہے۔

(۲) حضرت نوحؑ کے متعلق یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے کہ ان پر ایمان لانے والے صرف ان کے گھر کے لوگ ہی نہ تھے بلکہ ان کی قوم کے دوسرے لوگ بھی تھے، اگرچہ تھوڑے سے تھے۔ نیز یہ کہ کشتی میں یہ سب اہلِ ایمان سوار کئے گئے تھے۔ سورۂ ہود میں ہے: قلنا احمل فیھا من کل

زوجین اثنین واھلک الا من سبق علیہ القول ومن اٰمن وما اٰمن معہ الا قلیل۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا کہ ان سب کی نسل ناپید ہو گئی۔ اس کے برعکس قرآن مجید دو جگہ تصریح کرتا ہے کہ بعد کی نسلیں انھیں لوگوں کی اولاد تھیں جو حضرت نوح کے ساتھ کشتی پر سوار کیے گئے تھے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ذریۃ من حملنا مع نوح۔ اور سورۂ مریم میں فرمایا: من النبیین من ذریۃ اٰدم وممن حملنا مع نوح۔ اس کے جواب میں آپ کا یہ ارشاد کہ سورۂ صٰفٰت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وجعلنا ذریتہ ھم الباقین۔ اور یہ حصر پر دلالت کرتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں مقصود یہ ظاہر کرنا نہیں ہے کہ صرف حضرت نوحؑ کی اولاد ہی باقی رہی بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن لوگوں نے حضرت نوحؑ کو کربِ عظیم میں مبتلا کیا تھا وہ مٹ گئے اور باقی اُس شخص کی ذریت ہی رہی جس کو وہ مٹا دینا چاہتے تھے۔

(۳) زلیخا سے حضرت یوسفؑ کے نکاح کا کوئی ثبوت نہ قرآن میں ہے، نہ کسی حدیثِ صحیح میں اور نہ بنی اسرائیل کی معتبر روایات میں۔ نیز قرآن سے اس عورت کی توبہ کا بھی ثبوت نہیں ملتا۔ پھر خواہ مخواہ اس قصے کی صحت پر اصرار کی کیا ضرورت ہے؟ جس بدچلنی کا ارتکاب امرأۃ عزیز سے ہوا تھا حضرت لوط کی بیوی کے متعلق اس طرح کی کسی بدچلنی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ رہا آپ کا یہ ارشاد کہ کفر سے زیادہ بدچلنی اور کیا ہو سکتی ہے، تو آپ خود غور کریں گے تو آپ کو اس کی کمزوری معلوم ہو جائے گی۔ زنا اور اس کے مقدمات ایک ایسی بدچلنی ہیں۔ جو بالاتفاق تمام عالم انسانی میں قبائح اور رذائل میں سے شمار ہوتی ہے۔ اس سے ملوّث ہونا اور بات ہے اور کفر و شرک میں مبتلا ہونا اور بات۔ انبیاء علیہم السلام کے آباء و اجداد اور بعض کے اہلِ بیت تک کفر و شرک میں مبتلا رہے ہیں، مگر بے عصمتی میں مبتلا نہیں رہے۔ اعتقادی حیثیت سے کفر و شرک خواہ کتنے ہی اشد ہوں مگر اخلاقی حیثیت سے بے عصمتی بہت زیادہ پست اور ذلیل چیز ہے جسے کفار و مشرکین تک بھی ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ (ا-م)

خالق کے تخلیقی آرٹ میں تنوّع اور تجدّد

سوال:

مجھے علم نباتات میں کوئی مہارت نہیں، تاہم تفہیم القرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے چند سوالات پیدا ہوئے ہیں جنہیں اطمینان حاصل کرنے کے لئے پیش کرتا ہوں۔

ترجمان القرآن جلد ۳۵، عدد ۳،۴ صفحہ ۲۳۱ پر یہ حاشیہ درج ہے کہ "ایک ہی درخت ہے اور اس کا ہر پھل دوسرے پھل سے نوعیت میں متحد ہونے کے باوجود شکل جسامت اور مزے میں مختلف ہے" اور "ایک ہی جڑ ہے اور اس سے دو الگ تنے نکلتے ہیں جن کے پھل ایک دوسرے سے مختلف ہیں"۔

"مزے میں مختلف" ہونے کی یہ رائے جو آپ نے لکھی ہے، یہ مشاہدے کی بنا پر ہے یا کتابی علم کی بنا پر؟ اگر واقعہ یہی ہے تو بہتر تھا کہ چند ایک درختوں کی مثالیں بھی دی جاتیں۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ ایک ہی درخت کے پھل کے مزے میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوتا، البتہ درخت کے جس حصے کو سورج کی روشنی وافر ملتی ہے اس حصے کے پھل پہلے پختہ ہو جاتے ہیں۔ پھلوں کی شکل اور جسامت میں تو فرق ہو سکتا ہے مگر مزے میں فرق ہوتا سمجھ میں نہیں آیا۔"

جواب:

ہر درخت کے پھلوں کی جسامت، رنگ اور مزے کا انحصار اس غذا پر ہے جو ان کو جڑ کے توسط سے پہنچتی ہے، اور اس سردی گرمی پر ہے جو انہیں دھوپ، ہوا اور دوسرے شب و روز کے اثرات سے پہنچتی ہے۔ یہ سب عوامل چونکہ تمام پھلوں پر یکساں طریقے سے اثر انداز نہیں ہوتے، بلکہ ہر ایک پھل اور دوسرے پھل کے معاملے میں ان کے اثرات کچھ نہ کچھ متفاوت ہوتے ہیں، اس لئے جس طرح جسامت اور رنگ میں تھوڑا بہت تفاوت ضرور ہوتا ہے اسی طرح مزے میں بھی کم و بیش تفاوت ہوا کرتا ہے، اگرچہ بہت زیادہ نمایاں نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ یہ ایک عالمگیر حقیقت ہے کہ کائنات میں کوئی دو چیزیں بھی ایسی نہیں ہیں جو

جملہ حیثیات سے بالکل یکساں ہوں۔ ہر شے کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی انفرادیت رکھ دی ہے جس میں کوئی دوسری شے اس کی شریک نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ ایک ہی آدمی کے جسم کے ایک ہاتھ کے نشانات دوسرے ہاتھ کے نشانات سے مختلف ہوتے ہیں، ایک ہی چہرے کا دایاں رخ بائیں رخ سے مختلف ہوتا ہے، ایک ہی سر کے دو بال تک بالکل یکساں نہیں ہوتے۔ اس طرح صانعِ کامل واکمل نے یہ دکھایا ہے کہ اس کی صناعی کمال درجے کی جدت طراز ہے۔ اس حیرت انگیز شانِ خلاقی پر اگر آدمی کی نگاہ ہو تو اسے یقین آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بے پایاں کائنات کے ہر گوشے میں ہر وقت ہر ہر چیز پر تصرف اور توجہ فرما رہا ہے، اور ہر آن اس کا تخلیق اور تدبیری کام عالمگیر پیمانے پر جاری ہے۔ سخت نادان اور جاہل ہیں وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ خدا اس کارخانۂ ہستی کو حرکت میں لا کر کسی گوشے میں بیکار بیٹھ گیا ہے اور اب یہ کارخانہ ایک لگے بندھے قاعدے کے مطابق آپ سے آپ چل رہا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تخلیق میں یہ بے پایاں تنوع اور صنعت میں یہ کمال درجے کا تجدد کیسے پایا جا سکتا تھا۔ (ا۔م)

مسلم سوسائٹی میں منافقین

سوال:

اسلام کے خلاف دو طاقتیں ابتدا ہی سے برسرِ پیکار رہی آرہی ہیں: ایک کفر اور دوسری نفاق۔ مگر کافر کی نسبت منافق زیادہ خطرناک دشمن ثابت ہوا ہے، کیونکہ یہ وہ مارِ آستین ہے جو ماتھے پر اخوت اور اسلام دوستی کا لیبل لگا کر مسلمانوں کی بیخ کنی کرتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اگرچہ کافر اور منافق دونوں ہی بالآخر جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں لیکن منافق کی سزا کچھ زیادہ ہی "با مشقت" بتائی گئی ہے (بیشک منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے۔ نساء: ۲۱) اسی گروہ کے متعلق خدا تعالیٰ نے یوں دوٹوک فیصلہ کر دیا ہے کہ "اے پیغمبر! ان منافقوں کے حق میں تم خواہ دعائے مغفرت کرو

یا نہ کرو (برابر ہے کیونکہ) چاہے تم ستر مرتبہ ہی مغفرت کے لئے دعا کیوں نہ کرو، تب بھی اللہ انھیں کبھی معاف نہیں کرنے کا (توبہ - ۱۰) کم و بیش ساٹھ مختلف علامات اور امتیازی نشانیاں منافقین کی اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں بیان فرمائی ہیں جن کی روشنی میں ہم پاکستان کے اندر بسنے والی اس قوم کو جب دیکھتے ہیں جو مسلمان کہلاتی ہے تو اکثریت بلا مبالغہ منافقین کی نظر آتی ہے ——— گنہگار مسلمان اس گروہِ منافقین میں شامل نہیں ——— مگر گنہگار مسلمان وہ ہے جس سے برائی کا فعل باقتضائے بشریت جب کبھی سرزد ہو جاتا ہے تو فوراً ہی خدا اور قیامت کا خیال اسے آجاتا ہے۔ سچے دل سے توبہ اور پشیمانی کا اظہار کرتا ہے اور آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لیتا ہے۔ منافق اس کے خلاف اپنے برے کاموں پر واقعی نادم ہونے کے بجائے دانستہ کئے جاتا ہے۔

آپ کی نگاہ اور مطالعہ زیادہ وسیع ہے، براہِ کرم آپ اپنی رائے بیان فرمائیے کہ موجودہ مدعیانِ اسلام میں منافقین اور گنہگار اور متقی مسلمانوں کا تناسب اندازاً کیا ہے؟

دوسرا سوال گروہ منافقین کے ساتھ مسلمانوں کے طرزِ عمل کا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے یہ لوگ مسلمانوں کی جماعت سے خارج ہیں (اور یہ منافق قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تمہاری جماعت میں ہیں حالانکہ وہ تم سے نہیں۔ سورۂ توبہ) صرف یہی نہیں کہ ملتِ اسلامیہ سے خارج ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ "یہ منافق تمہارے دشمن ہیں ان سے خبردار رہو" (منافقون - ۱)

چونکہ یہ دشمن ہیں لہٰذا حکم ہوتا ہے کہ ان دشمنانِ دین سے کامل علیحدگی اختیار کرو۔ "ان منافقوں میں سے اپنے ساتھی اور دوست نہ بناؤ ..... اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست سمجھو نہ مددگار" (نساء - ۲:) اس بائیکاٹ میں یقیناً یہ بات بھی شامل ہے کہ منافقوں سے رشتے ناتے نہ کئے جائیں علیحدگی کی ایک اور صورت یہ بیان فرمائی ہے کہ "اے نبی! اللہ سے ڈرو اور ان کافروں اور منافقوں کی کسی بات کی پیروی نہ کرو۔" (احزاب - ۱) یعنی نہ تو نماز میں منافقوں کی پیروی کی جائے اور نہ ہی سیاسی قیادت قبول کی جائے، وغیرہ! بائیکاٹ کا اظہار ایک اور طریقہ سے بھی کرنا ضروری ہے۔ "اور ان منافقوں میں سے اگر کوئی مر جائے تو کبھی اس کی نماز جنازہ نہ پڑھو اور نہ ہی اس کی قبر پر دعائے مغفرت کے لئے کھڑے ہو" (توبہ - ۱۱)

بحیثیت ایک مسلمان کے خود آپ کا طرزِ عمل اس علیحدگی کے بارے میں کیا ہے؟ کیا مسلمانوں کو (جو قلیت میں ہیں) منافقوں سے (جن کی اکثریت ہے) قطع تعلق کر لینا چاہیے یا کچھ اتمامِ حجت کی گنجائش ہے؟

جواب:

یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت کتنے فی صدی کس کس قسم کے لوگ شامل ہیں، مگر میرا اندازہ اپنے مشاہدات و تجربات کی بنا پر یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کو منافق ٹھیرانے میں آپ نے بہت مبالغہ سے کام لیا ہے۔ بلاشبہ اہلِ ایمان کی ہم میں بہت کمی ہے اور یہی ہمارے اخلاقی و مادی تنزل کی اصل وجہ ہے، لیکن ہم میں اکثریت منافقوں کی نہیں بلکہ ایسے لوگوں کی ہے جو یا تو اسلام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے جاہلیت میں مبتلا ہیں یا تربیت اور نظامِ دینی کے فقدان کی وجہ سے ضعیف الایمان ہو کر رہ گئے ہیں اور اپنی گناہ گاری کا احساس رکھنے کے باوجود گناہ گارانہ زندگی سے بچنے پر قادر نہیں ہیں۔ منافقین ہمارے [1] اندر موجود تو ضرور ہیں مگر ان کی تعداد کم ہے اور وہ زیادہ تر عوام میں نہیں بلکہ اونچے طبقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ایک صحیح اسلامی نظامِ زندگی کے

---

[1] ہماری سوسائٹی ایک طویل دورِ انحطاط سے گزرتے ہوئے جس طرح کے ہمہ گیر اختلال میں مبتلا ہے اس میں کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ دعوتِ اصلاح دی جائے اور دینی نظم کو از سرِ نو بپا کیا جائے۔ منافقین اور فاسقین کا تعین کرنا اور ان سے بائیکاٹ کرنے سے آغازِ اصلاح کرنا صحیح طریق کار نہیں ہے۔ پھر یہ بات جس طرح نبی صلعم پر قطعیت کے ساتھ واضح کی گئی تھی کہ سوسائٹی میں کون کون لوگ منافقین ہیں آج محض علامات سے قیاس کر کے اس پر فیصلہ کرنا بڑی خوفناک ذمہ داری اپنے سر لینا ہے۔ ضعیف الایمان گنہ گاروں اور منافقین کو باہم دگر چھانٹنا ممکن نہیں ہے۔ اس چھنٹائی کا بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ یہاں اقامتِ دین کی ہمہ گیر جدوجہد کی جاتی رہے اور یہی جدوجہد صالحین، ضعیف الایمان لوگوں اور منافقین کو چھانٹنے کی کسوٹی بن جائے۔ یہ جدوجہد آہستہ آہستہ منافقین کو بالکل ممیّز کرتی جائے گی اور آگے چل کر ایک وقت آئے گا کہ ایسے عنصر کو پہچاننے میں کوئی دقت نہ رہے گی۔ اس وقت بائیکاٹ کے احکام پر عمل کرنا بھی ممکن ہوگا۔ (نائب مدیر)

قیام کے بارے میں ہماری ساری امیدیں اسی چیز سے وابستہ ہیں کہ ہماری قوم کی عظیم اکثریت اسلام کے ساتھ منافقانہ تعلق نہیں رکھتی ہے بلکہ حقیقت میں اس کی عقیدت مند ہے، اور صرف تعلیم، تربیت اور دینی تنظیم کی محتاج ہے۔ اس لئے ہم توقع رکھتے ہیں کہ اگر اس کمی کو پورا کرنے میں ہمارے صالح عناصر کامیاب ہو جائیں تو منافقین کی اقلیت آخرکار شکست کھا کے رہے گی اور یہاں ایک حقیقی اسلامی نظام اپنی اصل صورت اور روح کے ساتھ قائم ہو کر رہے گا۔ انشاءاللہ! ورنہ اگر کہیں خدانخواستہ اس قوم کی اکثریت منافق ہو چکی ہو تو ہمیں اسلام کے احیاء و اعادہ کی تمام امیدوں سے ہاتھ دھو لینا پڑے گا۔

اس کے بعد تو امید کی ایک کرن بھی باقی نہیں رہتی۔ (ا۔م)

”ماہنامہ زندگی“ رام پور (انڈیا)

موجودہ حالات پر اسلام کی روشنی بحث کرنے والا سنجیدہ ماہنامہ گزشتہ چار سال سے پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ”اشارات“، ”رسائل و مسائل“ اور ”تفسیر القرآن“ کے مستقل عنوانات کے علاوہ اسلام کو ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے پیش کرنے والے مضامین ہر ماہ اس میں شائع ہوتے ہیں۔

چندہ سالانہ ۵ روپے۔ فی پرچہ ۸ آنے۔

منیجر رسالہ ”زندگی“ رام پور (انڈیا)

مطبوعات

رسولِ اکرمؐ کی سیاسی زندگی

مؤلف : ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب استاذ قانون جامعہ عثمانیہ ، دکن۔
ناشر : ادارہ اسلامیات ۱۹۰ - انارکلی - لاہور۔
قیمت : مجلد مع گردپوش ۵ روپے (ضخامت ۲۸۰ صفحات)

تقسیم ہند کے بعد سے پاکستان میں تصنیف و اشاعتِ کتب اور لوگوں کے ذوقِ مطالعہ کا جیسا کچھ معیار سامنے ہے اس کے زیرِ اثر گنتی کی ایسی کتابیں شائع ہوتی ہیں کہ جن کے بارے میں کوئی تبصرہ نگار بے خوف یہ کہہ سکے کہ یہ کتاب پڑھی جانی چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تالیف انہی کتابوں کی صف میں شامل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے بہرحال ایک اسکالر کے ذوقِ تحقیق کے جو نتائج سامنے آتے ہیں اُن میں قاری کے لئے نئی معلومات موجود ہیں اور سوچنے کے نئے راستے کھلتے ہیں۔

کتاب مجموعی طور پر مستشرقانہ انداز کی ہے اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ہماری وہ واحد شخصیت ہیں جو مشرقی ہوکر پھر مستشرق قسم کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کی سیاسی زندگی کو پیش کرنے کے لئے جو نقشۂ مباحث آپ نے پسند کیا ہے اس میں ان پہلوؤں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی ہے جن میں ریسرچ و تحقیقات کے ذوق کو جولانیاں دکھانے کے لئے وسیع تر میدان مل سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ... اگر اسلام کے سیاسی مسائل سے عملی وابستگی رکھنے والا کوئی داعئ اصلاح و انقلاب اسی موضوع پر قلم اٹھاتا تو اس کا راستہ دوسرا ہوتا۔ وہ سارا زور یہ واضح کرنے پر صرف کرتا کہ

۱- نبی صلعم کی دعوت کا بنیادی کلمہ محض اعتقادی انقلاب ہی کا محرک نہیں، بلکہ سیاسی تغیر کا بھی محرک تھا۔

۲- نبی صلعم نے جماعتی تنظیم کے لئے کیا نقشہ وحی کی رہنمائی میں اختیار فرمایا؟

۳- مکہ میں جب مخالفانہ پروپیگنڈے کا طوفان چاروں طرف سے اُبلنے لگا تو قرآن نے آنحضورؐ کو کس پالیسی پر کاربند کیا؟

۴۔ پھر جب مخالفت تشدد میں بدل گئی تو اس دورِ آزمائش میں کن اصولوں پر نوخیز مسلم سوسائٹی نے حالات کا مقابلہ کیا؟

۵۔ نبی صلعم نے پیشِ نظر انقلاب کے لئے اپنے رفقا کی ذہنی و اخلاقی تربیت کس طرز پر کی۔

۶۔ تحریک نبویؐ مادہ پرستی (MATERIALISM) اور قوم پرستی (NATIONALISM) سے کس درجہ پاک تھی؟

۷۔ آنحضورؐ کی سیاست کاری کن غیر متغیر بنیادی اصولوں کی پابند تھی؟

۸۔ "نفع پرستی" کے بجائے از اول تا آخر ٹھوس اخلاقی اصولوں اور قدروں پر کاربند ہونے کا کس کس طرح اہتمام کیا گیا؟

۹۔ رسول اللہؐ نے حکمرانی کے لئے جو نیا اسلامی اسلوب دنیا کے سامنے عملاً رکھا وہ واقعات کی روشنی میں اپنے امتیازات کو کیسے نمایاں کرتا ہے؟

۱۰۔ ریاستِ مدینہ کی خارجہ اور داخلہ پالیسی کو وحی کے مطابق نبی صلعم نے کس طرح عملی صورت دی؟ وغیرہ۔

لیکن ڈاکٹر صاحب اپنا ایک پختہ مزاج رکھتے ہیں اور اس کے مطابق موصوف نے پیشِ نظر موضوع پر اپنا راستہ منتخب کیا ہے، اور بہرحال اس کتاب کے ذریعے آپ نے بہت کچھ ہمیں دیا ہے جس کے لئے شکر گزار ہونا چاہیئے۔ غنیمت یہ کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے اس تجدد پسند طبقے سے الگ ہیں جو اسلام کے متعلق کوئی ٹھوس واقفیت پیدا کئے بغیر اس کے نازک ترین موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور پھر اس کے ساتھ کھیلتا ہے اور مذاق کرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہرحال جو کچھ لکھا ہے ایک مسلمان کی طرح لکھا ہے چاہے آپ اُن سے کتنے ہی مقامات پر اختلاف کیا کریں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے لئے جو اچھوتا موضوع پسند کیا ہے اس کے لئے ریسرچ کرتے ہوئے جو دقتیں آپ کو محسوس ہوئی ہیں ان کو بہترین الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "اس کی تحریر کے زمانے میں علمی نقطۂ نظر سے ایک صحرا میں ہوں جہاں کتابوں کا پانی نہ ملنے کی وجہ سے وضو کی جگہ تیمم کرنی پڑی ہے۔" (یہ "تیمم کرنی پڑی" شاید کسی سند سے درست ہو، مگر مانوس نہیں)

رسول اللہ صلعم کی قبلِ نبوت اور آغازِ دورِ نبوت کی زندگی کو خاصی تفصیلی معلومات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مدینہ کی اسلامی ریاست کے کارپرداز کی حیثیت سے شرح و بسط کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ آنحضور کس حکمت اور تدبر کے ساتھ بڑی بڑی پیچیدگیوں سے ایک نازک دور میں عہدہ برآ ہوئے۔ ایک طرف قریشِ مکہ تھے، دوسری طرف یہود و نصاریٰ اور تیسری طرف عرب کے مختلف قبائل، اور خطرات کی اس مثلث کے درمیان ایک نرالا نظامِ ریاست ایامِ طفولیت سے گزر رہا تھا۔ اس موقع پر نبی صلعم نے جس طرح معاہدات کئے، خبریں حاصل کرنے کے انتظامات کئے، اپنے دشمنوں کی صفوں کو توڑنے میں کامیابی حاصل کی، اور وقت آنے پر کوئی کمزوری دکھائے بغیر جنگی اقدامات کئے، ان سب مراحل کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں خاصی روشنی ڈالی ہے۔

آنحضرت کے دعوتی خطوط اور امان ناموں اور معاہدوں کے لئے کتاب کا قریباً ایک تہائی حصہ وقف کیا گیا ہے۔ ان خطوط و فرامین اور معاہدوں کی مسودات کی تاریخی اور دینی اہمیت بھی بہت بڑی ہے اور پھر یہ ڈاکٹر صاحب کے ذوق سے خصوصی تعلق رکھنے والا میدان ہے، نیز مستشرقین نے ان کو موضوعِ بحث بنایا ہے، لہٰذا ان پر توجہ ہونا قدرتی تھا۔

علاوہ بریں ڈاکٹر صاحب کے کچھ اور مضامین بھی جو موضوع سے کسی قدر متعلق قرار دیئے جا سکتے ہیں، شاملِ کتاب ہیں۔ قرآن اور سیرتِ نبویؐ کے مطالعہ میں سہولت بہم پہنچانے کے لئے عرب اور ملحقہ ممالک کا ایک اچھا نقشہ بھی دیا گیا ہے۔ دورانِ مباحث میں بھی چھوٹے چھوٹے توضیحی نقشے موجود ہیں۔

تاریخی بحثوں میں خاص طور پر مطالعہ کئے بغیر کوئی مبصر و نگار زیادہ مداخلت نہیں کر سکتا۔ یہاں صرف ایسی چند چیزوں کی طرف اشارے کئے جاتے ہیں جو مطالعہ کرتے ہوئے بیک نگاہ محسوس ہوئیں۔

سورۂ روم کی پیشین گوئی متعلقہ "فتح روم" اپنے پورے ہونے سے "کئی سال" قبل کی نہ تھی (ص ۲۹۸) بلکہ "چند سال" قبل کی تھی کیونکہ قرآن میں "فی بضع سنین" کے الفاظ ہیں اور لفظ "بضع" دس سے زیادہ کے لئے عموماً نہیں بولا جاتا۔ رومی فتح ۲ ھ میں ہوئی اور یہ جنگِ بدر کی ہم وقت تھی۔ صلح حدیبیہ والی جو روایت ڈاکٹر صاحب نے سامنے رکھی ہے وہ معتبر نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی شرط کا

نصعد اگر مؤلف کے نوٹس میں آیا ہوتا جس پر فقہا نے بڑی بحثیں کی ہیں تو ردمی فتح کا صحیح زمانہ ان کے سامنے آجاتا۔

"نسی" کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی دیرینہ رائے یہ ہے کہ قمری اور کبیسہ مہینوں کو تطبیق دینے کے لئے ہر تیسرے سال کو لیپ کا سال شمار کرتے ہوئے قبیلۂ بنی فقیم کا سردار جس کا لقب قلمس ہوا کرتا تھا حج کے موقع پر منیٰ میں ایک خاص تقریب کے ساتھ اعلان کرتا تھا کہ اب جو ذی الحج چل رہا ہے اس کے بعد کا نیا چاند محرم الحرام کا نہیں، بلکہ ایک گمنام اور محرم مہینے کا چاند ہوگا اور محرم الحرام کا چاند اس کے بعد آئے گا (۲۰۲) حالانکہ یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ قرآن طریق "نسی" کو "زیادۃ فی الکفر" کہتا ہے، یعنی کوئی بڑی معصیت اس میں شامل تھی۔ وہ معصیت یہ تھی کہ مختلف مواقع پر عربی کیلنڈر کے انچارج اکابر کے مفاد کی رعایت سے ہے نسی کا مہینہ جہاں مناسب سمجھتے تھے لگا دیتے تھے۔ کبھی آگے کبھی پیچھے! ڈاکٹر صاحب کی تحقیق میں یہ چیز نہیں آئی۔

ص ۲۲۲ پر موسیٰ بن عمران نام کی دو شخصیتیں ہونے کا امکان (کسی قدر ضرورت کے تحت) ظاہر کیا گیا ہے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کا رجحان یہ ہے کہ سورۂ کہف میں موسیٰؑ کا جو طالبعلمانہ سفر مذکور ہے وہ بعض تاریخی دلائل سے موسیٰ علیہ السلام سے قبل کا ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن اگر سورۂ کہف کے مقصدِ نزول اور خصوصاً وقت کے جن سوالات کی طرف اس میں اشارات کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو واقعہ قطعی طور پر موسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہے۔ مگر تحقیق کا یہ میدان ایک مستشرق مزاج مؤرخ کا میدان نہیں ہے۔ افسوس کہ یہاں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔

ص ۲۳۰ پر یہودیوں میں دعوت پھیلانے کی حکمتِ نبوی پر گفتگو کرتے ہوئے قرآن کی آیت $\frac{2}{62}$ و $\frac{5}{69}$ کے حوالے سے ایک "بنیادی مذہب" کا تصور سامنے لایا گیا ہے جو اقل قلیل معتقدات پر مبنی تھا۔ پھر ص ۲۲۸ پر بنیادی مذہب کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب واضح کرتے ہیں کہ یہودیوں، عیسائیوں اور صابیوں سے مطالبہ نہ تھا کہ وہ اپنے اپنے مذہب ترک کر دیں بلکہ اپنے ہی الہامی مذاہب کی تجدید کرتے ہوئے چند بنیادی اصولوں پر عمل کریں، یعنی خدا اور رسول کو ماننا۔ ڈاکٹر صاحب کے

آخری الفاظ "یعنی خدا اور رسول کو ماننا" اور پھر ان پر یہ نوٹ کہ قرآن خدا اور رسول میں فرق کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور ص ۱۴۴ کا یہ نوٹ کہ "یہ ایک بے معنی چیز ہوگی کہ نبی کے بتائے ہوئے راستے پر تو چلیں لیکن خود نبی کو نہ مانیں" ڈاکٹر صاحب کی پوزیشن کو صاف کرنے والے ہیں لیکن بنیادی مذہب کے متعلق مذکورہ باتیں بڑی ڈھیلی ڈھالی اور غلط فہمی پیدا کرنے والی ہیں، جیسے کہ آپ لکھتے ہیں کہ "وہ دعوت آج بھی باقی ہے کہ اپنے ہاں کے اصلی مذہب پر رجوع کرو" (۲۲۸)۔ سوال یہ ہے کہ ان کے "اپنے ہاں" سے کیا؟ تحریف شدہ کتب یا مذہبی روایات! کیا نبی صلعم ان کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے رہتے تھے؟ یقیناً نہیں۔ تو پھر صاف بات یوں کیوں نہ کہہ دی جائے کہ دعوت یہ تھی کہ اسلام کی طرف پلٹو جو تمہارا بھی دین تھا، لیکن تم نے اس کی حفاظت نہ کی اور اب وہ خالص اور مکمل شکل میں صرف قرآن اور نبی صلعم سے مل سکتا ہے۔ اس قسم کے مسائل میں ادھوری باتیں کہنے سے ہمیشہ فتنے پیدا ہوتے ہیں لہٰذا ٹھکی ہوئی بات کہنی چاہیے۔

ص ۳۵۳ پر دین و سیاست کو علیحدہ کرنے کی ایک نظیر قرآن سے نکال کر سامنے لائی گئی ہے اور اس تفریق کو "تقسیم کار" کے حسین لفظ سے ذکر کیا گیا ہے۔ طالوت بادشاہ نہیں مقرر کئے گئے تھے بلکہ جنگی کمانڈر تھے۔ قوم نبی سے مطالبۂ جہاد کر رہی تھی اور اس کے لئے ایک امیر جہاد مطلوب تھا۔ غلط فہمی لفظ "ملک" سے ہو رہی ہے جس کا معنی صرف بادشاہ ہی نہیں۔ اس پر ترجمان القرآن میں ایک مرتبہ اصلاحی صاحب تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔

ورنہ "عبادت و سیاست" میں تقسیم کار کی نوعیت کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ طالوت نبی کے ماتحت تھے یا اس سے آزاد؟ اگر ماتحت تھے تو اصل اقتدار نبی ہوا اور اگر آزاد تھے تو پھر بتایا جائے کہ نبی کے ہوتے ہوئے نبی سے آزاد حاکم کیا مسلمان بھی ہو سکتا ہے؟

"مشترک حکمرانی کی اجازت" کا پورا باب کچھ "بات بنانے" کی کوشش کا مظہر ہے۔ ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام نے بطور وزیر (نائب) طلب کیا تھا اور "واشرکہ فی امری" کا یہ ترجمہ غلط ہے کہ اسے میری امیری میں شریک بنا، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ میرے کام میں، میری مہم میں،

میری ذمہ داری میں شریک کر۔ عمان کے جن دو حکمرانوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی کوئی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں علاقوں کی کوئی تقسیم ہو یا ذمہ داریوں کی، اور پھر ان کے اوپر اسلامی ریاست کی طرف سے عمرو بن العاص ریذیڈنٹ تھے ہی جو ہم آہنگی (COORDINATION) کا وسیلہ تھے۔

اگر ایک اسکول کے دو ہیڈ ماسٹر، ایک فرم کے دو منیجر اور ایک عدالت کے دو جج بیک وقت مامور ہوں، درانحالیکہ ان میں نائب و منیب کا تعلق نہ ہو تو اس سے جو فساد رونما ہوگا وہی کسی ریاست کے ایک سے زائد حاکموں کی وجہ سے رونما ہوگا۔ اغلباً شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا مدعا بھی دوسرا ہے، وہ یہ کہ اگر ایک امیر کسی پہلو سے کمزوری محسوس کرے تو وہ اس پہلو کے لئے کسی دوسرے شخص کو نائب کی حیثیت سے ساتھ لے سکتا ہے لیکن اسلامی ریاست میں جمہوریت و شورائیت اور تقسیم کار کے نظام کے باوجود اختیار کا آخری مرکز فردِ واحد ہوتا ہے۔

کتاب کے آخر میں انڈکس بھی موجود ہے۔

طبِ اسلامی

مؤلفہ: جناب حکیم محمد یحییٰ خان صاحب حاذق العصر۔

شائع کردہ: مکتبہ ارمغان۔ راولپنڈی۔

قیمت: تین روپے بلا جلد۔ مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

یہ کتاب بھی ایک علمی اور تحقیقی کتاب ہے۔ اس کے مؤلف علمِ طب اور فنِ طب دونوں میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور موصوف نے جو کچھ لکھا ہے بڑی ذمہ دارانہ حیثیت سے لکھا ہے۔ یہ موضوع جن لوگوں کے لئے وجہ دلچسپی ہو ان کو لازماً یہ کتاب پڑھنی چاہیئے۔ اس کے پس منظر میں ایلو پیتھی اور یونانی طب کے حامیوں کی متعصبانہ بحثوں کی پیدا کردہ فضا موجود ہے لیکن حکیم یحییٰ صاحب خود کم سے کم متعصبانہ نقطۂ نظر سے بالاتر ہیں۔ انھوں نے صرف وقت کے کچھ سوالات کا جواب دیا ہے اور بہت معقول طریق سے دیا ہے۔

شروع ہی میں موصوف نے اس سوءِ ظن کا ازالہ کر دیا ہے کہ اطباء "اسلامی" کے لفظ سے

خدمات کی قدر گھٹائی جا سکتی ہے۔

بلاشبہ ہماری طب کی چند قابلِ قدر خصوصیات ہیں جنھیں مغرب نے نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً "مرض" کے ساتھ ساتھ "مریض" کو ملحوظ رکھنا، مقامی حالات اور مزاج کو پیشِ نظر رکھنا، تشخیص کا فردِ واحد سے متعلق ہونا، زیادہ ہلکی اور سادہ ادویہ کا استعمال وغیرہ۔ ان خصوصیات کو جدید تحقیق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی اُس حد تک ملحوظ رکھا جا سکتا ہے جس حد تک ضروری ہو، ورنہ ان کو ہر حال میں بت بنا لینا بھی واجب نہیں۔

ہماری رائے میں "طبِ اسلامی" کا اصل قابلِ قدر پہلو فنِ معالجہ کو اسلام کے اخلاقی حدود کا پابند بنانا ہے۔ طبیب کا خادمِ خلق ہونے کے جذبے سے کام کرنا، اپنے مطب کو دارالعلاج ہونے کے ساتھ ساتھ سوشل اصلاح کا ایک مرکز بنائے رکھنا، مریضوں سے شفقت و دلجوئی کے ساتھ معاملہ کرنا، غربا پر خاص توجہ دینا، دوا سازی میں دیانت داری سے کام لینا اور حلال و حرام کی تمیز قائم رکھنا وغیرہ چیزیں ایسی ہیں کہ جو آج مغرب میں تو ناپید ہیں ہی، خود مسلمان اطبا کے ہاں سے رخصت ہوتی جا رہی ہیں۔ اس اخلاقی جوہر کو قائم رکھتے ہوئے اگر ہماری طب نئی تحقیقاتوں سے استفادہ کرے تو یہ ہر لحاظ سے خیر ہوگا۔

یہ چند باتیں برسبیلِ تذکرہ عرض کر دی گئی ہیں، ورنہ کتاب کی قدر و قیمت اپنی جگہ! قیمت کسی قدر زائد معلوم ہوئی لیکن اب تو کاغذ کی گرانی اس اعتراض کا دروازہ بند کر دے گی۔

نوٹ

متعدد کتابوں اور پمفلٹوں پر ریویو لکھ کر کاتب کے حوالے کیا گیا تھا لیکن دو ہی کتابوں نے پورے آٹھ صفحے لے لئے، اس لئے بقیہ کو روک لیا گیا ہے۔ متعلقہ مصنفین اور ناشرین حضرات اس معذرت کو قبول فرمائیں۔

(نائب مدیر)

پھر سے کچھ کر دیئے جائیں گے[1] اور سب کے سب اللہ واحدِ قہار کے سامنے بے نقاب ہو جائیں گے۔ اس روز تم مجرموں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں ہاتھ پاؤں جکڑے ہونگے، تارکول[2] کے لباس پہنے ہوئے ہونگے اور آگ کے شعلے ان کے چہروں پر چھائے جا رہے ہونگے۔ یہ اس لئے ہوگا کہ اللہ ہر متنفس کو اس کے کئے کا بدلہ دے۔ اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لئے۔ اور یہ بھیجا گیا ہے اس لئے کہ ان کو اس کے ذریعہ سے خبردار کر دیا جائے اور وہ جان لیں کہ حقیقت میں خدا بس ایک ہی ہے اور جو عقل رکھتے ہیں وہ ہوش میں آجائیں ع ۷ ع

---

[1] اس آیت اور قرآن کے دوسرے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں زمین و آسمان بالکل نیست و نابود نہیں ہو جائیں گے بلکہ صرف موجودہ نظامِ طبیعی کو درہم برہم کر ڈالا جائیگا۔ اس کے بعد نفخِ صورِ اوّل اور نفخِ صورِ ثانی کے درمیان ایک خاص مدت میں، جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، زمین اور آسمانوں کی موجودہ ہیئت بدل دی جائیگی اور ایک دوسرا نظامِ طبیعت، دوسرے قوانینِ فطرت کے ساتھ بنا دیا جائیگا۔ وہی عالمِ آخرت ہوگا۔ اس میں نفخِ صورِ ثانی کے ساتھ ہی تمام وہ انسان جو تخلیقِ آدم سے لیکر قیامت تک پیدا ہوئے تھے، از سرِ نو زندہ کئے جائیں گے اور میدانِ حشر میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے۔ قرآن کے اشارات اور حدیث کی تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ حشر اسی زمین پر برپا ہوگا، یہیں عدالت قائم ہوگی، یہیں میزان لگائی جائیگی اور قضیۂ زمین برسرِ زمین ہی چکایا جائیگا۔ نیز یہ بھی قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ ہماری وہ دوسری زندگی جس میں یہ معاملات پیش آئیں گے، محض روحانی نہیں ہوگی بلکہ ٹھیک اُسی طرح جسم و رُوح کے ساتھ ہم زندہ کئے جائیں گے جس طرح آج زندہ ہیں، اور ہر شخص ٹھیک اُسی شخصیت کے ساتھ وہاں موجود ہوگا جسے لئے ہوئے وہ دنیا سے رخصت ہوا تھا۔

[2] بعض مترجمین و مفسرین نے قَطِرَان کے معنی گندھک اور بعض نے پگھلے ہوئے تانبے کے بیان کئے ہیں، مگر درحقیقت عربی میں قَطِرَان کا لفظ زفت، قیر، رال، اور تارکول کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۴۔ [illegible] ی، بہت سے لوگوں کے ایمان تک متزلزل ہو جائیں گے۔ آخر حضرت عثمان اور حضرت علی کے زمانے کی تاریخ اور بعد کے فتنوں کے حالات آپ کہاں لے جا کر دفن کریں گے کہ کسی کی ان پر نظر نہ پڑنے پائے؟

مودودی صاحب سے صاحب تحریر بزرگ کو یہ بھی شکایت ہے کہ انھوں نے امام غزالی کو حدیث میں کمزور ٹھیرایا ہے اور امام مہدی کی علامات کے سلسلہ میں جو احادیث وارد ہیں ان کا انکار کیا ہے۔

میں صاحبِ تحریر بزرگ کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں جرموں میں سے کسی جرم میں بھی مودودی صاحب منفرد نہیں ہیں۔ ناقدینِ حدیث نے خود ہی ان دونوں جرموں میں پہل کر کے دوسروں کے لئے راہ کھول دی ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں بکثرت کمزور حدیثیں نقل کی ہیں جن کی ناقدینِ حدیث نے نشان دہی کی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو امام صاحب نے عام صوفیہ کے طریقے پر پند و موعظت کے سلسلے کی حدیثوں میں محدثانہ چھان بین کو ضروری ہی نہ خیال کیا ہو، یا یہ بات ہو کہ فلسفہ و تصوف کی دلچسپیوں نے ان کو حدیث کی تحقیق و تنقید کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیا ہو۔ بہر حال احیاء العلوم میں بکثرت کمزور حدیثیں موجود ہیں اور اس معاملے میں ذوق کا سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ نقدِ حدیث کے لگے بندھے اصول ہیں۔ اگر صاحبِ تحریر بزرگ ان اصولوں سے واقف ہیں تو خود بھی وہ احیا کی حدیثوں کو تول کے دیکھ سکتے ہیں کہ وہ محدثانہ اصولوں پر پوری اترتی ہیں یا نہیں۔ اس کے بعد اگر امام صاحب کے ساتھ ان کے اندر حدیث کی حفاظت و صیانت کے لئے بھی کوئی حمیت ہوگی تو وہ بھی وہی کہیں گے جو مودودی صاحب نے کہا ہے۔ فن کے معاملے میں ذوق اور تکلفانہ احترام کوئی چیز نہیں ہے۔ ناقدینِ حدیث اس معاملے میں کسی کو بھی نہیں بخشتے۔

مہدی کی علامات سے متعلق جو روایتیں وارد ہیں ان کے درجے اور ان کی نوعیت سے متعلق اگر کوئی اور چیز میسر نہ آئے تو صاحبِ تحریر بزرگ ابنِ خلدون کے مقدمے ہی کی بعض